(التوکل)

(اللہ پر بھروسہ)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	اللہ کی رحمت	۷
۲	حقوق العباد کی حقیقت	۸
۳	غلام اور بیٹے میں فرق	۹
۴	ہماری ملکیت کی حقیقت	۱۰
۵	بچوں کی ملک اور ہماری ملک میں فرق	۱۱
۶	حِکمت مِلکیت	۱۲
۷	مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا مطلب	۱۳
۸	ایک جاہل کا علاج	۱۴
۹	حکایت	۱۵
۱۰	مال کی کمی زیادتی میں حکمت	۱۶
۱۱	حقیقی مالک	۱۶
۱۲	حقوق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسمیں	۱۸
۱۳	قبولیت توبہ کے درجات	۱۸
۱۴	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بشر ہونا رحمت ہے	۲۰

۱۵	دلی رنجش کا نقصان	۲۱
۱۶	حالت قبض کی کیفیت	۲۲
۱۷	قبض کا علاج	۲۲
۱۸	صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ کی رحمت	۲۳
۱۹	صفات مُستشیر اور مشورہ کا فائدہ	۲۴
۲۰	شیخِ کامل	۲۵
۲۱	دنیا میں کفّار اور کفر کے ہونے میں حکمت	۲۶
۲۲	کشش شیخ کا اثر	۲۸
۲۳	تسلی شیخ کا اثر	۲۹
۲۴	قرآن میں تمدن کی تعلیم	۳۰
۲۵	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دانشمندی	۳۱
۲۶	جہالت کی انتہا	۳۱
۲۷	کفار کی عقل پر پردہ	۳۲
۲۸	انبیاء علیہم السلام اور مرشدین کامل العقل ہوتے ہیں	۳۳
۲۹	بعض سادہ لوح بزرگوں کی حکایات	۳۳
۳۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست	۳۴

۳۱	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیدار مغزی	۳۵
۳۲	حقیقتِ توکّل	۳۶
۳۳	نام کے مسلمان	۳۷
۳۴	''ان شاء اللہ'' کے متعلق ایک حکایت	۳۷
۳۵	ترک اسباب کا حکم	۳۸
۳۶	ذکر کا فائدہ	۳۹
۳۷	عقلی دلیل	۳۹
۳۸	اسباب میں انہماک	۴۰
۳۹	اسباب کی دوسری قسم	۴۰
۴۰	اسباب کی تیسری قسم	۴۱
۴۱	توکل کے معنی	۴۱
۴۲	متوکلین کی ایک غلطی	۴۱
۴۳	اختیار اسباب کے ساتھ توکل	۴۳
۴۴	سفر میں توکل	۴۴
۴۵	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا توکل	۴۵
۴۶	توکل کا مقتضی	۴۵

۴۷	سفر کا فائدہ	۴۶
۴۸	عمر بن عبدالعزیزؒ کی حالت خوف	۴۶
۴۹	مقصود وعظ	۴۷
۵۰	شبہ کا جواب	۴۸
۵۱	اولیاء اللہ کے اطمینان کی وجہ	۵۰
۵۲	بندہ کو علم غیب نہ ہونے کا فائدہ	۵۱
۵۳	شیخ کامل کی ضرورت	۵۱
۵۴	حاصل وعظ	۵۳
۵۵	مشورے کے فوائد	۵۳
۵۶	فضول مباحث	۵۴
۵۷	ایک جنٹل مین کی اصلاح	۵۵
۵۸	اپنی وضع کا اہتمام	۵۶
۵۹	جمہوریت کے حق میں آیت قرآنی سے غلط استدلال اور اس کا جواب	۵۷
۶۰	حکومت شخصی کا اثبات	۵۸
۶۱	توکل کی حقیقت	۵۹

وعظ

(التوکل)

(اللہ پر بھروسہ)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے ۴/ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں منبر پر تشریف فرما ہوکر ۳ گھنٹے پندرہ منٹ تک توکل کے موضوع پر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی۔

حضرت مولانا محمد عبداللہ گنگوہی صاحب نے تحریر فرمایا۔

خلیل احمد تھانوی

۸/۱۱/۱۴۳۲ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ م بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾(۱)

اللہ کی رحمت

یہ دو آیتیں ہیں جو اپنی خصوصیت شان نزول کے اعتبار سے ایک خاص مقصود کے واسطے نازل ہوئی تھی جس کا حاصل جناب رسول اللہ ﷺ سے خطا

(۱) ''بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے، اور اگر اپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور اُن سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تم سے کوئی جیت نہیں سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بد ایسا کوئی ہے جو تمہارا ساتھ دے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیئے'' سورۂ ال عمران ۱۰۹۔

معاف کرانا ہے بعض مقصرین صحابہ رضی اللہ عنہم کی (۱)، وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں سے بعض سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے ناخوش ہوگئے تھے کہ ان سے کچھ کوتاہی جس کا حاصل کسی قدر تجاوز ہے حدود شرعیہ سے ہوگئی تھی (۲) گو صحابہ اس میں معذور تھے اس لئے کہ بقصد تجاوز ان سے وہ کوتاہی نہیں ہوئی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی حق بجانب تھے اس لئے کہ گو تعمد نہ تھا لیکن تاہم غفلت تو تھی (۳) اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم قدرے ناخوش ہوگئے تھے مگر حق تعالیٰ کی تو بڑی رحمت ہے اور نیز نظر ہے بندے کے عذروں پر بلکہ بندہ کو اپنے بعضے وہ عذر معلوم بھی نہیں جو حق تعالیٰ کو معلوم ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو اپنے نفس پر وہ رحمت نہیں ہے جو خالق تعالیٰ شانہ کو اس کے حال پر ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو معذور فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خطائیں معاف کرنے کا امر فرماتے ہیں (۴)۔

حقوق العباد کی حقیقت

اور ہر چند کہ وہ حقوق جن میں صحابہ سے کوتاہی ہوئی تھی حقوق اللہ ہی تھے کہ قانون کے اعتبار سے ان کے معاف کرنے میں حق تعالیٰ کو اختیار ہے اور قانون کے اعتبار سے میں نے اس لئے کہا کہ واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے کہ بندہ کے حقوق بھی خود ہی معاف فرمادیں اس لئے کہ وہ حقوق العباد درحقیقت اللہ ہی کے حقوق ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے مالک ہیں تو بندے کے اموال اور انفس (۵) اور عزت وآبرو کے بھی وہی مالک ہیں تو جو کوئی کسی بندہ

---

(۱) بعض وہ صحابہ جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی ہوئی ان کی خطا معاف کرانا ہے (۲) شرعی حدود سے باہر نکلنا (۳) جان بوجھ کر اگرچہ نہیں کیا لیکن لاپرواہی تو تھی (۴) حکم فرمایا (۵) جان۔

کو مالی یا جسمانی ضرر(۱) پہنچائے گا اس نے فی الواقع (۲) اللہ کی مِلک میں تصرف کیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کسی کا غلام ہو اور اس کے پاس مال ہو تو اگر کوئی اس غلام کا وہ مال لے گا تو واقع میں اس نے اس کے مولیٰ (۳) کی حق تلفی کی پس اس واقعیت کے لحاظ سے حقوق العباد کو حقوق اللہ کہنا صحیح ہے لیکن کیا انتہاء ہے رحمت کی کہ ان حقوق اللہ کا نام حقوق العباد رکھ دیا۔

غلام اور بیٹے میں فرق

جیسے اپنے غلام یا اپنے بچہ سے اپنی کسی شے کی نسبت (۴) یہ کہیں کہ یہ شے تمہاری ہے اس کہنے سے وہ شے اس کی نہیں ہوجاتی لیکن ان کی دلجوئی کے واسطے کہتے ہیں کہ یہ شے تمہاری ہے بلکہ بچہ کو تو اگر کوئی شے ہبۃً دے دیں (۵) تو وہ مالک بھی ہوجاتا ہے اور غلام مملوک تو کسی شے کا کسی صورت سے مالک ہی نہیں ہوتا اور یہی راز ہے شریعت کا کہ شارع نے غلامی کو موانع ارث سے قرار دیا ہے (۶) یعنی اگر کوئی شخص مرجاوے ایک بیٹا جو کسی کا غلام ہے وارث چھوڑ دے تو اس کو میراث نہ ملے گی اس لئے کہ اگر اس کو میراث ملے تو وہ مالک نہ ہوگا بلکہ اس کا مولا مالک ہوگا جو اس مورث سے اجنبی ہے تو توریث اجنبی کی لازم آوے گی (۷) اس لئے غلام کو میراث نہ ملے گی دیکھئے شریعت کا کیا عدل ہے (۸) غلام کو میراث نہیں دی اس لئے کہ جب وہ مالک ہی نہ ہوگا تو اس کو حسرت ہی حسرت ہوگی پس یہ مسئلہ بھی فرع ہے اسی کی کہ غلام کسی شے کا مالک نہیں ہوتا اور بیٹا ہبہ سے مالک ہوجاتا ہے۔

---

(۱) نقصان (۲) حقیقت میں (۳) آقا (۴) کسی چیز کے بارے میں (۵) کوئی چیز تحفۃً دے دیں (۶) اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ غلام کسی کا وارث نہیں ہوتا (۷) جس کی وراثت ہے اس کے لئے غیر ہے تو غیر کا وارث بننا لازم آتا ہے (۸) انصاف ہے۔

ہماری ملکیت کی حقیقت

اور اسی فرق کی وجہ سے میں نے مثال میں یہ قید لگائی تھی کہ اپنی شے کی نسبت کہا پس بیٹے سے مثلاً جو کہا جاتا ہے کہ یہ چارپائی تمہاری ہے یا یہ کٹورہ تمہارا ہے اس سے کیا مقصود ہوتا ہے ظاہر ہے یہ مقصود نہیں کہ تم اس کے مالک ہو محض دلجوئی مقصود ہے۔ اسی طرح نسبت ہے حق تعالیٰ کے بعض حقوق کی ہماری نسبت (کہ ان کو حقوق العباد کہا) ورنہ وہ بھی واقع میں ان ہی کے حقوق ہیں اس سے اندازہ کیجئے حق تعالیٰ کی محبت کا اپنے بندہ کے ساتھ۔ ورنہ ہماری کیا شے ہے(۱)۔

بلکہ ہماری جان بھی ہماری نہیں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے خودکشی کو حرام فرمایا ہے اگر جان ہماری ہوتی تو ہم اس میں جس طرح چاہتے تصرف کر سکتے یہی وجہ ہے کہ جن معاصی میں دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے(۲) وہ تو ظاہر ہے کہ حرام ہیں ہی اور ان کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کی چیز میں تصرف کرے لیکن جن معاصی سے (۳) خود اپنے آپ کو ضرر پہنچتا ہے (۴) ان معاصی کا حاصل خود اپنے جوارح (۵) اور حواس میں تصرف ہے جیسے کسی کو بُری نگاہ سے دیکھنا کسی نامشروع (۶) آواز کا سننا یہ بھی حرام ہے اس لئے کہ نہ کان ہمارے ہیں نہ آنکھیں ہماری ہیں سب سرکاری چیزیں ہیں جس موقع پر صرف کرنے کے لئے اجازت دی گئی ہے ان ہی مواقع پر اُن کو صرف کرنا چاہیئے ورنہ مجرم ہوں گے۔

الحاصل اس تقریر سے یہ معلوم ہوگیا کہ ہم نہ اپنی جان کے مالک ہیں نہ مال کے مالک ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس پر بھی جو بعض حقوق کو حقوق العباد فرمایا تو یہ محض رحمت ہے اور پھر یہ نہیں کہ محض حقوق العباد

(۱) ہماری کیا چیز ہے (۲) نقصان (۳) گناہوں (۴) نقصان (۵) اعضاء (۶) کسی ایسی آواز کا سننا جس کو سننا شرعاً منع ہے۔

برائے گفتن ہی فرمادیا ہو بلکہ اس پر آثار اور احکام بھی مرتب فرمائے۔

بچوں کی مِلک اور ہماری مِلک میں فرق

بچوں کے نام زدتو جو شئے مجازاً کی جاتی ہے وہ برائے نام ہی ہے محض دلجوئی کے لئے ہی ہے آثار اور احکام اس پر مِلک کے مرتب نہیں ہوتے اس لئے کہ اس کو اس شے میں تصرف کا اختیار نہیں ہوتا مثلاً وہ کسی کو دے نہیں سکتا، کسی کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا اور غلام کے پاس جو شئے ہے وہ اس سے بھی ضعیف درجہ میں ہے(۱)۔

اور خدا تعالیٰ ایسے مولیٰ ہیں کہ باوجود اس کے کہ ہر شئے کے مالک حقیقی وہی ہیں مگر پھر بھی جس شئے کی نسبت فرمادیا کہ یہ تمہاری ہے تو برائے نام نہیں کیا بلکہ اس میں تصرف کا بھی اختیار دے دیا ہے کہ خواہ اس شئے کو تم استعمال کرو یا کسی کو دے دو یا بیچ دو یہ سب ہمارے نزدیک معتبر ہے اگر تم کسی کو دے دو گے تو ہم بھی یہی کہیں گے کہ اب یہ شئے اس شخص کی ہوگئی۔ کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ ایک تو دلجوئی کے لئے ہماری طرف منسوب کیا دوسرے اگر کسی کو ہم دے دیں تو اس کو نافذ قرار دیا اور اس کو معتبر قرار دیا۔ بخلاف ماں باپ کے کہ وہ اتنی دلجوئی نہیں کرسکتے، اگر وہ بچہ کسی کو وہ شئے دینے لگے تو روک دیں گے پس جب یہ ثابت ہوا کہ حقوق العباد واقع میں حقوق اللہ ہی ہیں تو اگر اس واقعیت کے اعتبار سے وہ معاف کرنے لگیں تو کرسکتے ہیں(۲) لیکن قانون شریعت کے اعتبار سے ان حقوق سے اپنا تعلق بالکل اٹھالیا اور یہ فرمادیا کہ جب تک کہ اصحاب حقوق معاف نہ کریں گے ان کے حقوق کو ہم استقلالاً معاف نہ کریں گے (۳)۔

---

(۱) اس کا تعلق اس سے بھی کمزور ہے (۲) جبکہ حقوق العباد اصل میں حقوق اللہ ہی ہیں تو اگر اللہ معاف کرنا چاہے کرسکتے ہیں (۳) جب تک صاحب حق معاف نہیں کریگا ہم خود سے معاف نہیں کریں گے۔

حکمتِ مِلکیت

پس اس نسبت کو باوجود اس کے ضعیف بلکہ اضعف بلکہ نہ ہونے کے جو اس قدر قوی کیا ہے (۱) تو اس میں کیا حکمت ہے۔ پورا علم تو حِکم کا حق تعالیٰ ہی کو ہے مگر ایک حکمت اس کی مجھ جیسے ناداں کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور اس سے قدر ہوگی شریعت کی کہ شریعت کا وجود ہمارے لئے کس قدر نعمت عظمیٰ ہے کہ اگر قانون شریعت نہ ہوتا تو زندگی گزارنا مشکل ہوجاتا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر اشیاء کی یہ نسبت عباد (۲) کی طرف نہ ہوتی اور یہ قانون مقرر نہ کیا جاتا تو حقیقت اور واقعیت کا مقتضا تو یہ تھا (۳) کہ کوئی شخص کسی شے کا مالک نہ ہوتا کیونکہ واقع میں حق تعالیٰ ہی سب کے مالک ہیں۔

پس اس صورت میں مثل مباحات عامہ (۴) کے ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ جس شئے سے چاہے متمتع ہوتا (۵)۔ میں تمہارے پاس کی چیز چھین لیتا تم میری چیزیں لے بھاگتے۔ پس اگر اس حقیقت کا ظہور ہوتا تو تمام عالم میں فساد برپا ہوجاتا۔ ہاں اگر فنا کا سب پر غلبہ ہوتا اور سب کے سب مغلوب الحال ہوتے اور اضمحلال (۶) وجود کی حالت سب پر ہوتی تو البتہ اس صورت میں کوئی مفسدہ نہ تھا (۷) لیکن تمام عالم تو اہل حال نہیں ہے حالت تو یہ ہے کہ انانیت (۸) کے دعوے کرنے

(۱) ہماری طرف جو ملکیت کی نسبت کی ہے اگرچہ وہ بہت ہی کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے پھر بھی اس کو اتنا مضبوط کیا ہے (۲) بندوں کی طرف (۳) ہر چیز کا مالک چونکہ اللہ پاک ہے اس حقیقت کا تقاضا یہ ہوتا کہ کوئی کسی چیز کا مالک نہ ہوتا (۴) وہ چیزیں جن کا استعمال سب کے لئے جائز ہوتا ہے (۵) جس چیز سے چاہیئے فائدہ اٹھائے (۶) کمزوریٔ وجود (۷) سب پر اگر فنائیت کا غلبہ ہوتا اور سب پر یہ حال غالب ہوتا تو شاید فساد نہ ہوتا (۸) حال تو یہ ہے کہ سب میں خودی بھری ہوئی ہے اور سب اپنی خواہشات کو پورا کرنا چاہتے ایسے لوگوں کی کثرت ہے۔

والے اور اپنے خطوط (۱) کو پورا کرنے والے اور اپنے نفس کو دنیاوی نعم سے متمتع کرنے والے مقدار میں زیادہ ہیں تو اس حالت میں اگر اس حقیقت کا ظہور ہوتا تو روک (۲) تو کچھ ہوتی نہیں تم میری شے چھین لیتے میں تمہاری شے لے لیتا کوئی کسی کے مکان پر قابض ہوجاتا کوئی کسی کا مال لے بھاگتا کوئی کسی کو قتل کردیتا اور یہ کتنا بڑا مفسدہ تھا پس اس صورت میں امن کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ قانون شریعت کا جاری ہو اور اس نسبت کی حفاظت کی جاوے کہ فلاں شئے میری ہے اور فلاں شئے زید کی اور فلاں مکان اس شخص کا اور فلاں جائیداد عمرو کی ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ شریعت کیا چیز ہے کہ اُس نے بڑے بڑے مفاسد کو روک رکھا ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے شعر کا مطلب

اور یہی معنی ہیں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کا

سرِّ پنہان است اندر زیرو بم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم (۳)

مطلب یہ ہے کہ یہاں حقائق واسرار میں ایک سر پنہاں ہے (۴) اگر ظاہراً اس کو بیان کردوں تو جہاں میں فساد برپا کردوں بظاہر یہ مضمون شاعرانہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے حقائق کو بیان کیا ہے انہوں نے کونسا فساد مچادیا ہے منصور نے انا الحق کہا تو کیا ہوا یا کوئی کلمہ توحید کا بیان کردے تو عالم میں کیا تغیر ہو بہت سے بہت وہ اپنی جان سے جائے بس اس کے معنی یہی ہیں کہ سر پنہاں سے مراد حقیقت وتوحید کا راز ہے اور توحید کا مقتضٰی یہ ہے کہ کوئی

(۱) حظ کی جمع ہے بمعنی حصہ (۲) جب کوئی کسی چیز کا مالک نہ ہوتا تو ہر ایک دوسرے کی چیز استعمال کرتا جس سے فساد برپا ہوجاتا (۳) ''ہر نشیب وفراز میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جس کو اگر صاف صاف کہوں تو دنیا تہہ وبالا ہوجائے'' (۴) پوشیدہ راز۔

وجود کوئی ہستی موجود حقیقی کے سامنے موجود اور ہست کہنے کے قابل نہیں ہے(۱)۔ چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے ((الممکنات ماشمت رائحة الوجود))(۲)اور مالک ہونا اور اسی طرح تمام اضافات یہ سب ہستی کے آثار ہیں۔ پس مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں حقیقت کا راز بیان کردوں اور عام خیالات پر اس کا اثر ہوجاوے اور اس لئے یہ سب اضافات باطل ٹھہریں تو عالم میں فساد برپا ہوجاوے(۳)جیسا مذکور ہوا اور اس کا میں سبب ہوجاؤں اس سے شریعت کی قدر کرنا چاہیئے کہ اس نے کتنے بڑے فساد کو روکا ہے۔

ایک جاہل کا علاج

کہاں ہیں وہ صوفی اور کہاں ہیں وہ شاہ صاحب جو کہتے ہیں کہ شریعت کوئی چیز نہیں ایسے صوفی اور شاہ صاحب کا علاج یہ ہے کہ ان کے کپڑے اور لنگی اتار لی جاوے اگر کچھ تعرض کریں تو کہنا چاہیئے کہ صرف شرعی قانون کے اعتبار سے یہ چیزیں تمہاری ہیں اور وہ آپ کے نزدیک کوئی شئے نہیں ہے اور اس کو تم تسلیم ہی نہیں کرتے پھر کیوں تعرض کرتے ہو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے جاہل کی حکایت لکھی ہے کہ وہ باغ میں گیا اور وہاں جا کر بے تکلف میوے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ باغ والا آیا اور اس نے مواخذہ کیا کہنے لگا میں بھی خدا کا پھل بھی خدا کا درخت بھی خدا کا باغ بھی خدا کالا فاعل الا اللہ اور لا موجود الا اللہ (۴) پھر تو کون ہوتا ہے روکنے والا اس نے کہا کہ اچھا اور نوکر سے پکار کر کہا لائیو میرا سوٹا اور رسا اور رسے سے باندھ

(۱)اللہ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کے اظہار کے قابل نہیں (۲)ممکنات نے وجود کی بو نہیں سونگھی (۳)دنیا میں جو اشیاء کی نسبت ایک دوسرے کی طرف ہے کہ یہ میری یہ تیری اگر یہ نہ ہو تو فساد برپا ہوجائے (۴)اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں۔

کر اس کو خوب ٹھوکا وہ فریاد کرنے لگا کہا چلاتے کیوں ہو، ڈنڈا بھی خدا کا رسا بھی خدا کا مارنے والا بھی خدا کا اور تو بھی خدا کا پھر شکایت کے کیا معنی اس وقت تو مدعی صاحب کو ہوش آیا اور توبہ کی ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیار ست اختیار ست اختیار(۱)

واقعی ایسوں کا یہی علاج ہے کہ لوگوں کا مال لوٹنے کے واسطے موحد اور جبری بنے ہیں اور اپنے مال کو حفاظت سے رکھتے ہیں۔

حکایت

جیسے ایک پیشہ ور واعظ کی حکایت مشہور ہے کہ وعظ میں کہا کہ خدا کے واسطے مال خوب دینا چاہیئے کوئی شے پاس نہ رکھے وعظ کہہ کر جب گھر آئے تو دیکھا کہ بیوی ننگی بیٹھی ہے (۲) ایک چھلاّ تک بدن پر نہیں پوچھا کہ زیور! کیا ہوا؟ کہا تم نے ہی تو وعظ میں کہا تھا کہ مال خدا کے واسطے دینا چاہیئے سب فقراء کو دے آئی، کہنے لگے ارے بیوقوف میں نے وعظ اس لئے نہیں کہا تھا کہ تو لوگوں کو دے آئے۔ میں نے تو اس لئے کہا تھا کہ لوگ ہم کو دیں پس جب ان شاہ صاحب کے کپڑے چھینے جاویں گے اس وقت ان کو شریعت کی قدر ہوگی اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ شریعت ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت ہے کہ شریعت نے بعض چیزوں کو ہماری طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ واقع میں مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہیں تاکہ کوئی کسی کے مال پر دست بُرد نہ کرے (۳)۔

---

(۱) ''کہنے لگا میں نے اپنے عقیدے سے کہ انسان مجبور ہے توبہ کی میں کہتا ہوں کہ انسان مختار ہے مختار ہے''

(۲) ہاتھ اور کانوں میں سے سب زیور اتار کر صدقہ کر دیا کوئی چوڑی اور بالی بندہ وغیرہ جسم پر نہیں (۳) کسی کا مال چھین کر نہ بھاگے۔

مال کی کمی زیادتی میں حکمت

اور نیز کسی کے ساتھ احسان کرنے میں دریغ نہ کرے اس لئے کہ واقع میں تو کوئی شے ہماری ہے نہیں تو بڑی بے مروتی ہے کہ ہمارے پاس کوئی شئے زائد ہو اور ہمارے دوسرے بھائیوں کو ضرورت ہو اور ہم اس کو نہ دیں اگرچہ عدل کا مقتضٰی تو یہ تھا کہ سب کے پاس یکساں مقدار میں مال اور اسباب ہوتا لیکن اس میں بھی بڑی بے انتظامی ہوتی اس لئے کہ ہم کو مثلاً ضرورت ہوتی خط بنوانے کے لئے نائی کی اور اس کو بلاتے تو ہرگز نہ آتا اور کہتا کہ تم ہی میرا خط بنادو مجھ کو کیا ضرورت یا ضرورت ہوتی مثلاً معماروں (۱) کی تو کہیں نہ ملتے، دھوبی بھنگی نہ ہوتے کپڑے میلے ہوجاتے اور سڑ جاتے حق تعالیٰ کی رحمت ہوئی کہ اول تو اشیاء کو ہماری طرف منسوب کیا اور پھر باہم تفاوت رکھا (۲) کسی کو عمل کا محتاج کردیا کسی کو مال کا اس طور سے تمام عالم کا انتظام فرمادیا۔

حقیقی مالک

لیکن اصل فطرت اور حاجت پر نظر کرکے انسان کو سمجھنا چاہیئے کہ میرے پاس جو زائد ہے یہ دوسرے حاجتمندوں کا حصہ ہے مجھ کو ان سے دریغ نہ کرنا چاہیئے یہ نسبتیں تو حق تعالیٰ نے اس لئے مقرر فرمادی ہیں تاکہ تمہارے مال کو کوئی زبردستی نہ لے سکے اس لئے نہیں ہیں کہ جس کی یہ نسبتیں پیدا کی ہوئی ہیں اُس ہی کے حکم سے انحراف (۳) کرنے لگو، اگر وہ یہ نسبت قطع کردیں (۴) تو پھر کیا کرلوگے اور اگر کہو کہ اب تو جو قواعد مقرر ہوگئے ہیں ان کا کوئی منسوخ کرنے والا نہیں

(۱) مستری مزدوروں کی (۲) فرق رکھا (۳) منہ پھیرنے لگو (۴) ختم کردے۔

ہے اس لئے کہ نبوت تو ختم ہوگئی ہے۔ پھر یہ نسبتیں کیسے قطع ہوسکتی ہیں تو اس پر اگر ناز ہے تو اللہ تعالیٰ کو دوسرا طریقہ بھی آتا ہے اور وہ تکوینی طریقہ ہے باوجود حفاظت قانون نسبت کے یہ مال تمہارے پاس حساً نہ رہے۔ لیجئے وہ نسبت یوں منقطع ہوسکتی ہے مثلاً آگ لگ کر سب متاع جل جاوے(۱) یا چور لے جاویں۔ یاد رکھو تم ان اضافات اور نسبت کے اندر کسی طرح حقیقت کا شائبہ مت سمجھو یہ تو محض انتظام عالم کے لئے ہے ورنہ فی الواقع ہر شے پر حق تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف تام ہے اسی لئے ارشاد ہے: ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾(۲) لفظ میراث اس لئے فرمایا کہ اگر ملک فرماتے تو شبہ ہوسکتا تھا کہ بظاہر ملک تو ہماری ہے اس لئے علی سبیل التسلیم ارشاد ہے(۳) کہ اگر مان لیا جاوے کہ تمہاری ملک ہے تو جب تم سب مرجاؤ گے پھر بتلاؤ اس وقت یہ سب چیزیں کس کی ملک ہونگی اس وقت تو سب ہماری ہیں پھر ہم سے کیوں دریغ کرتے ہو۔

الحاصل اس تقریر سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کو حقوق العباد کے معاف فرمادینے کا بھی پورا حق ہے لیکن قانون میں تفصیل کردی پس اس قانون کی رو سے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو اس موقع پر کوتاہی ہوئی تھی وہ حقوق العباد کی قسم سے نہ تھی بلکہ ایک حکم شرعی میں اُن سے لغزش(۴) ہوئی تھی کہ جس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق نہیں کہہ سکتے بلکہ خالص حق اللہ کہیں گے ہاں اس معنی کر حق الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی کہہ سکتے ہیں کہ احکام شرعیہ کی مخالفت کرنا آپ کے بتلائے ہوئے اور امر کئے ہوئے احکام کی مخالفت ہے مگر اصطلاح شرع میں اس کو حقوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا جاتا اس کے احکام جداگانہ نہیں ہیں وہی حقوق اللہ کے احکام ہیں۔

(۱) سامان (۲) اللہ ہی کے لئے ہے زمین و آسمان کی میراث (۳) تمہاری یہ بات مان کر کہ تمہاری ملک ہے یہ کہا ہے (۴) کوتاہی۔

حقوق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسمیں

حاصل یہ ہے کہ حقوق الرسول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ حق جو خود ذات رسول کی طرف راجع ہے جیسے کوئی رسول ﷺ کے مال کی چوری کرلے یا ان کو کوئی اذیت(۱) پہنچائے دوسرے وہ کہ انہوں نے جو احکام الٰہی تعلیم فرمائے ہیں ان کی مخالفت کرے۔ قسم اخیر (۲) کو حق رسول اللہ ﷺ کہنا مجازاً ہوگا اس لئے کہ وہ احکام خود رسول اللہ ﷺ کے بنائے ہوئے نہیں، ہاں بتائے ہوئے ہیں شارع تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہیں اور پہلی قسم حقیقۃً حق رسول ﷺ ہے۔ پس صحابہ کی کوتاہی قسم ثانی سے ہے جو حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا حق اور مجازاً رسول اللہ ﷺ کا حق ہے تو اس کوتاہی کو اللہ تعالیٰ خود معاف کرسکتے تھے چنانچہ کر بھی دیا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ (۳) لیکن کیا انتہا ہے حضور ﷺ کی محبوبیت کی کہ آپ سے بھی فرمائش ہے کہ ہم نے تو معاف فرمادیا آپ بھی معاف فرمادیں اگر کوئی کہے جب کہ وہ کوتاہی محض حق اللہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف بھی کردیا تو پھر حضور ﷺ سے معاف کرانے کے کیا معنی؟ اور وہ کون سی چیز باقی رہ گئی جس سے حضور ﷺ کی معافی متعلق ہوگی۔ بات یہ ہے ایک تو توبہ ہے دوسری تکمیل توبہ۔ تو حق تعالیٰ کے معاف فرمانے سے توبہ تو متحقق ہوگئی لیکن تکمیل اس توبہ کی حضور ﷺ کے معاف کرنے سے ہوگی۔

قبولیت توبہ کے درجات

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھو کہ گناہ کے دو اثر ہیں ایک آجل (۴) یعنی عذاب کا ہونا دوسرے عاجل (۵) یعنی گناہ سے قلب میں ایک ظلمت پیدا ہوجانا جو سبب ہوتا ہے آئندہ دوسرے معاصی کے صدور کا۔ اور جب

(۱) تکلیف (۲) دوسری قسم (۳) اللہ نے ان کو معاف کردیا (۴) آخرت (۵) فی الفور۔

بندہ توبہ کرتا ہے تو قبولیت توبہ کے بھی دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ عذاب سے نجات ہوجاوے۔ دوسرے یہ کہ قلب میں ظلمت اور کدورت جو گناہ سے ہوئی تھی وہ نہ رہے۔ تو یہ محض توبہ سے نہیں جاتی بلکہ بار بار توبہ کرنے سے ندامت سے گھل جائے اور مجاہدات اور مراقبات طویلہ کرنے سے جاتی ہے۔ ہاں توبہ بشرائطھا (۱) کرنے سے عذاب سے نجات ہوجاوے گی۔ باقی یہ کدورت اور ایک قسم کی رکاوٹ اور حجاب جو فیما بین اللہ وبین العبد (۲) پیدا ہوگیا ہے سو نفس توبہ اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بزرگ کے حق میں ہم سے کوتاہی ہوجاوے مثلاً ان کو ٹھوکر لگ جاوے اور پھر ان سے اس لئے بے ادبی کو معاف کرایا اور انہوں نے معاف کردیا لیکن اس معاف کرنے سے تسلی نہیں ہوتی بار بار کہتے ہیں کہ حضرت بڑی حماقت ہوئی بہت قصور ہوا اور وہ برابر کہہ رہے ہیں کہ میں نے معاف کردیا تم اس قدر کیوں پریشان ہوتے ہو مگر دل ہے کہ مانتا نہیں جب بہت کہہ سن لیں گے اور روپیٹ لیں گے اس وقت اطمینان ہوتا ہے جب ادنیٰ سی عظمت کا یہ اثر ہے تو حق تعالیٰ کی عظمت تو غیر محدود ہے اتنا جلدی قلب صاف ہونا مشکل ہے وہاں تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

بردل سالک ہزاراں غم بود　　گر زباغِ دل خلالے کم بود (۳)

اور ایسے غم کے موقع پر ضرورت ہوتی ہے شیخ مبصر (۴) کی کیونکہ بعض مرتبہ اس غم مفرط میں ضرر بھی ہوجاتا ہیں (۵)۔ تو شیخ اس وقت غم کو منع کرتا ہے

---

(۱) توبہ کو اس کی شرائط قبول کے ساتھ کرنے سے (۲) حجاب جو بندے اور اللہ کے درمیان پیدا ہوگیا (۳) ''اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہوجائے تو سالک کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں'' (۴) صاحب نظر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے (۵) غم کی زیادتی میں نقصان بھی ہوتا ہے۔

اگر چہ مقتضی اصلی معصیت کا یہی ہے کہ بے حد غم ہونا چاہیئے (۱) مگر کبھی اس سے ہلاکت اور کبھی مایوسی کا احتمال ہوجاتا ہے اس لئے شیخ تعدیل کرتا ہے غرض یہ ہے وہ اثر جو بعد قبول توبہ بھی کانٹا سا کھٹکتا ہے تو اگر چہ حق تعالیٰ نے توبہ ان کی قبول فرمالی ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم چونکہ جان نثار تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لئے ان کا دل ابھی اس لئے صاف نہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مکدر ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بشر ہونا رحمت ہے

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تکدر بمقتضائے بشریت تھا اور اس کا ہونا خاصہ بشریت کا ہے اور یہ سراسر رحمت ہے اس لئے کہ اگر اس قسم کا تکدر و نیز دوسرے خواص بشریہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت نہ ہوتے اور ہم کو آپ کی بشریت کے اعتقاد کا مکلّف نہ بنایا جاتا تو بدوں اس کے ہماری توحید کامل نہ ہوتی افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعض لوگ اس کی نفی کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو درجہ الوہیت تک پہنچاتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک استفتاء آیا تھا اس میں سائل نے یہ پوچھا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا بھی کھاتے تھے ایک شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم والدہ شریفہ کے بطن سے ایسے ہی پیدا ہوئے تھے جیسے اور بچے پیدا ہوتے ہیں یا ران سے پیدا ہوئے تھے، غرض یوں چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر الوہیت (۲) ثابت کردیں۔ لیکن یہ کتنی ہی کوشش کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم الوہیت کے درجہ تک نہیں پہنچ سکے اور اگر بالفرض پہنچیں بھی تو کیسے الٰہ ہوں گے (۳) ظاہر

(۱) اگر چہ گناہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہونے کا بہت غم ہو (۲) خدائی (۳) کیسے خدا ہوں گے۔

ہے کہ اللہ ناقص ہوں گے۔ رسالت کا حق ان لوگوں نے اچھا ادا کیا کہ آپ کے اندر نقص ثابت کیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ عبد تھے لیکن عبد کامل تھے۔ بالکل عقل مسخ ہوگئی ہے اور پھر اس کو محبت رسول ﷺ سمجھتے ہیں۔ غرض حضور ﷺ میں عبدیت کا اعتقاد سراسر رحمت ہے۔

دلی رنجش کا نقصان

اور اپنی بشریت وعبدیت کے آثار سے یہ ہوا کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک پر ان حضرات کی طرف سے ایک قسم کی طبعاً کدورت تھی اور حضورت ﷺ کی کدورت سے ان حضرات کے قلوب پر بھی تکدر کا اثر تھا اور ایسا تکدر اگرچہ حالاً مضر نہیں ہے۔ لیکن احیاناً سبب بعد کا ہوجاتا ہے (۱) اس لئے کہ جب اس کا اثر زیادہ بڑھتا ہے تو قلب ضعیف ہوکر تعطل کی نوبت آجاتی ہے شیطان کہتا ہے کہ تیرا کوئی عمل مقبول تو ہے نہیں پھر کیوں بے فائدہ مشقت اٹھاتا ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ عمل کے اندر بشاشت (۲) قلب کی معین ہے اور تکدر کا خاصہ ہے کہ قلب میں بشاشت نہیں رہتی ہے اور بشاشت ہی معین ومحرک تھی جب وہ جاتی رہی تو نرا اعتقاد رہ گیا اب عمل کے اندر اس شخص کو بڑا بھاری مجاہدہ کرنا پڑتا ہے جس پر دوام دشوار ہے پس اگر یہ کدورت بڑھی اور اس کو استقرار ہوگیا (۳) تو رفتہ رفتہ اعمال چھوٹ جاتے ہیں اور جو ہمت کرکے اس حالت میں بھی عمل کرتے ہی رہے تو یا تو وہ بشاشت عود کرآتی ہے اور اگر اس نے عود نہ کیا تو یہ ہمت زیادہ نہیں چلتی اعمال رخصت ہوجاتے ہیں غرض اس کدورت وانقباض کے ہوتے ہوئے دوام علی العمل (۴) سخت دشوار ہے۔

(۱) لیکن کبھی کبھی دوری کا سبب بن جاتا ہے (۲) دلی خوشی (۳) اگر یہ کدورت دل میں جم گئی (۴) عمل پر ہمیشگی بہت مشکل ہے۔

حالت قبض کی کیفیت

بھلا اور کوئی تو کس شمار میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون مستقل مزاج ہوگا تین سال تک جو قبض رہا یعنی وحی منقطع ہوگئی اس مدت کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کلفت آئی (۱) کہ کئی مرتبہ ارادہ فرمایا کہ پہاڑ سے گر کر جان دیدوں لیکن جب ایسا ارادہ فرماتے جبریل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور تسلی فرماتے کہ آپ نبی ہیں آپ سے حق تعالیٰ کو بہت کام لینا ہے آپ ایسا ارادہ نہ فرماویں تین سال کے بعد وحی نازل ہوئی اور قلب مبارک سے یہ بوجھ زائل ہوا جس کی نسبت ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ (۲) وزر سے یہی حالت مراد ہے نہ کہ گناہ پس جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کوہ وقار واستقلال بھی اس کے متحمل نہیں ہوئے (۳) تو اور تو کیا کسی کا منہ ہے جو اس کے تحمل کا دعویٰ کرے۔

قبض کا علاج

مگر ایسی حالت میں شیوخ کی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ صبر کرو اور یہ جواب محض ٹالنے کے لئے نہیں ہے بلکہ راز اس میں یہ ہے کہ صبر کرنا سبب ہوجاتا ہے بسط کا مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں — تازہ باش وچیں میفکن برجبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو — آں صلاح تست آتش دل مشو

دوسرے بزرگ اس کے بعد بسط کی بشارت دے کر تسلی کرتے ہیں ؎

---

(۱) پریشانی (۲) ''کیا ہم نے آپ کی خاطر آپکا سینہ کشادہ نہیں کردیا اور ہم نے آپ پر سے آپکا وہ بوجھ اتار دیا۔ جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی'' (۳) وقار استقلال کے پہاڑ بھی اس کو برداشت نہ کر سکے (۳) ''جب تیرے روح میں انقباض پیدا ہوجائے تو اس کے اندر بھی کشادگی تلاش کرو تازہ رہ اور اپنی پیشانی پر شکن مت ڈال۔ اے راہ رو جو تجھ کو انقباض ہو تو وہ تیری بہتری کے لئے ہوا اس پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں''۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں مخور(۱)

یوسف گم گشتہ سے مراد بسط ہے جو قبض آنے سے مفقود ہو گیا ہے ایک اور بزرگ کہتے ہیں ۔

اگر چہ دور افتادم بایں امید خور سندم کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد(۲)

بہر حال یا تو بسط ہو اور یا امید بسط کی ہو تو عمل پر استقامت کر سکتا ہے اور اگر دونوں نہ ہوں تو قلب ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ عمل چھوٹ جاتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ کی رحمت

غرض بعض اوقات اس تکدر سے یہ ضرور ہوتا ہے اس لئے باری عز اسمہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس سے بھی پاک ہو جاویں اور یہ کیفیت ان میں نہ رہے اس لئے ارشاد ہے کہ آپ بھی معاف فرمادیں پس ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ اس کی تمہید ہے اور ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ مقصود ہے اور سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا آگے اس کے ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ بڑھایا یعنی آپ ہی معاف فرمادیجئے اور ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرمادیا تھا تو ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ اب تحصیل حاصل ہے(۳)۔

بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت (۴) جس کا

(۱) ''کھویا ہوا یوسف علیہ السلام ایک روز کنعان واپس آجائے گا غم مت کرو اور تیرا غم کا جھونپڑا گلستان بن جائے گا'' (۲) ''اگر چہ میں دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا ہاتھ دوبارہ پکڑے'' (۳) جو بات ان کو پہلے سے حاصل ہے یہ اس کے حاصل کرنے کا حکم دینا ہے (۴) دلی رنجش کا دور ہونا۔

سبب ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ہوگا لیکن سبب کا وجود تو وجود مسبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کردینے سے بدوں حق تعالیٰ کی تصرف کی رفع کدورت تو ضروری نہیں (۱) کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک دونوں قسمیں متحقق ہوگئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح (۲) کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیونکہ اعمال میں آئندہ کو ترقی موقوف ہے زیادہ انشراح (۳) پر پس رحمت پر رحمت اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ یعنی ان سے کام میں مشورہ بھی کیجئے کہ اس سے ان کا انشراح ترقی پذیر ہوکر وسیلہ ترقی مراتب کا ہوگا۔

صفاتِ مستشیر اور مشورہ کا فائدہ

اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاصہ ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ دیکھئے مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں دو وصف پائے جاویں اول تو اُس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خیر خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے دوسرے جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔ غرض مشورہ ہر شخص سے نہیں لیا جاتا پس

(۱) آپ کے معاف کردینے کے باوجود بغیر اللہ کے چاہے ان کے دل سے رنجش نہیں نکل سکتی (۲) پہلے جو دل میں کشادگی تھی وہ پھر پیدا ہوگئی (۳) اعمال میں ترقی جب ہوگی جب دل زیادہ کھلا ہوا ہوگا۔

جس شخص سے مشورہ لیا جاوے گا تو اس کو پہلے سے اور زیادہ تعلق بڑھ جاوے گا اس لئے کہ وہ اس سے استدلال کرے گا کہ ہماری بات پر اس کو پورا اطمینان ہے ہماری دیانت پر اس کو اعتماد ہے اور ہم کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ہم سے امر خاص میں مشورہ لیا جاوے اس سے دل بڑھ جاوے گا اور دل کے بڑھ جانے کو بڑا دخل ہے اعمال صالحہ کی ترقی میں پس یہ راز ہے اس کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا(۱) کہ ان سے مشورہ لیجئے تا کہ وہ انشراح ان کا اور زیادہ بڑا ہو کر سبب ہو جاوے اعمال صالحہ کے اندر ترقی کا جو سبب ہے قرب کا۔

شیخِ کامل

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کامل مربی وہ ہے جو طالب کے دل کو بڑھاتا رہے اور دلجوئی اور تسلی کرتا رہے اس بارہ میں تو ہم نے اپنے حضرت مرشد(۲) علیہ الرحمۃ کو دیکھا ہے کہ رحمت کے مجسمہ تھے ہر شخص کی تسلی کرتے تھے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ کسی کو دل شکستہ کیا ہو اسی واسطے جو نفع اور جگہ برسوں میں ہوتا تھا وہ وہاں لمحوں اور منٹوں میں ہوتا تھا ایسے ہی شیخ کی نسبت حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بندۂ پیر خرابا تم کہ لطفش دایم است
زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست(۳)

یعنی ہم تو اُس کے غلام ہیں جس کا لطف دائمی ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی وقت عتاب نہیں کرتے امر ناجائز اور خلاف شرع پر عتاب بھی ضرور فرماتے ہیں (۴) مگر واللہ ان کے عتاب میں بھی لطف ہوتا ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شیوخ جو کبھی کبھی اپنے خدام سے ناراض ہو جاتے ہیں حتی کہ نکال بھی دیتے

(۱) حکم دیا (۲) حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (۳) ''میں پیر میخانہ کا غلام ہوں کیونکہ اس کی مہربانی ہمیشہ ہے اور شیخ اور زاہد کی مہربانی کبھی ہے کبھی نہیں ہے'' (۴) ناجائز کام اور خلافِ شریعت کام پر غصہ بھی ہوتے ہیں۔

ہیں تو زبان سے تو ناراض ہوتے ہیں لیکن دل سے کشش کیا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نکالنے سے وہ جاتا نہیں اور معذرت کرتا ہے اور معافی چاہتا ہے یہ ان کے ہی جذب کا اثر ہے پس اکثر محبت اول شیخ کو ہی ہوتی ہے ورنہ ان کی نفرت کی صورت میں دوسرے کا انجذاب عادتاً مستبعد ہے(۱) مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

نفرت فرعون تو میدان از کلیم(۲)

یعنی فرعون جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لایا اور ان سے عداوت رکھتا تھا اس کی وجہ یہ نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ ایمان لے آوے اور فرعون انکار کرتا تھا بلکہ خود موسیٰ علیہ السلام کو ہی اس سے نفرت تھی فرعون کو ان کا قلب دفع کرتا تھا اور اگر ان کے قلب میں کشش ہوتی تو بعادت غالبہ فرعون کی مجال نہ تھی کہ وہ منجذب نہ ہو(۳) لیکن حق تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ ایمان لاوے اس لئے اس کے اسباب جمع کر دیئے اور موسیٰ علیہ السلام کے قلب کو اس کی طرف سے سخت کر دیا کہ یہ بھی اسباب حرمان سے ہو گیا(۴)۔

دنیا میں کفار اور کفر کے ہونے میں حکمت

اور عادت غالبہ اور اکثر اس لئے کہا گیا کہ کبھی اس میں تخلف بھی ہوتا ہے(۵) تاکہ حق تعالیٰ اپنی مشیت کا اثر دکھلا دیں جیسا ابوطالب کے لئے ارشاد ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾(۶) اور اس عادت غالبہ پر اس کو مبنی کر سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے لئے چاہتے تھے کہ ایمان لے آویں اللہ تعالیٰ نے اس تقاضا کو آپ کے قلب سے دفع (۷) فرمایا کہ آپ کا

(۱) ایک کے نفرت کرنے کی وجہ سے دوسرے کا اس کی طرف مائل ہونا عادۃً بعید ہے (۲) ''فرعون کی نفرت تو موسیٰ سے سمجھ'' (۳) ایسا ممکن نہیں تھا کہ فرعون ان کی طرف مائل نہ ہوتا (۴) فرعون کے محروم ہدایت ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہو گیا (۵) کبھی اس کے خلاف بھی پایا جاتا ہے (۶) آپ جیسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے (۷) دور کر دیا۔

تقاضا اسباب انجذاب (۱) سے ہوتا تو اس سبب کو مرتفع فرمادیا (۲) چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (۳) دوسری جگہ فرماتے ہیں ﴿لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾ (۴) ایک اور مقام پر خطاب ہے ﴿فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ (۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بہت زیادہ توجہ اس جانب تھی کہ آپ کو شب و روز اس کا غم رہتا تھا۔ اس کو ان خطابات سے ہلکا کیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کشش و جذب قلب کو گھٹایا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ ایسا کیوں کیا گیا اگر آپ کے جذب کو کم نہ کیا جاتا اور سب ایمان لے آتے تو کیا حرج تھا بلکہ دین کی ترقی اور زیادہ تھی بات یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی حکمت کا مقتضا ہے کہ عالم میں کفر کا رہنا بھی ضرور ہے اسی کی نسبت حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد (۶)

اگر کوئی کہے کہ اگر آگ ابولہب کو نہ جلاتی تو کیا حرج ہے؟ جواب یہ ہے کہ راز دان حقائق نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جمیل ہیں اور جمال کے سبب ہر اسم مقتضی ظہور کو ہے اور ان ہی اسماء میں سے منتقم (۷) بھی ہے وہ بھی ظہور کو چاہتا ہے (۸) اور اس کے ظہور کی یہی صورت ہے کہ دنیا میں کفر و معصیت کرنے والے بھی ہوں تاکہ وہ دوزخ میں جاویں علیٰ ہذا غفور بھی نام پاک باری تعالیٰ کا ہے (۹) اس کے ظہور کا مقتضٰی یہ ہے کہ معاصی کا وجود بھی عالم میں ہو (لیکن اس سے کوئی شخص معصیت و کفر کے ارتکاب سے معذور نہ قرار دیا جاوے گا (۱۰) اس لئے کہ رضا اور شے ہے اور

(۱) آپ کا چاہنا ان کے اسلام کی طرف مائل ہونے کا سبب بن جاتا (۲) اس سبب کو دور کر دیا (۳) آپ ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے (۴) ان پر غم نہ کیجئے (۵) ان سے اعراض کیجئے (۶) ''عشق کے کارخانے میں کفر بھی ناگزیر ہے کیونکہ آگ کس کو جلائے گی اگر ابولہب نہ ہو'' (۷) انتقام لینے والا (۸) اللہ کی صفت انتقام کا تقاضا بھی یہ ہے کہ وہ ظاہر ہو (۹) اللہ تعالیٰ کا نام غفور یعنی مغفرت کرنے والا بھی ہے جس کا تقاضا ہے کہ دنیا میں نافرمانی پائی جائے جس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اس طرح اس صفت کا ظہور ہو (۱۰) اللہ کی اس مشیت کی وجہ سے کوئی آدمی کفر کو اختیار کرتے ہیں معذور نہیں سمجھا جائے گا۔

مشیت دوسری چیز ہے(۱) یہ صحیح ہے کہ سب کچھ حق تعالیٰ کی مشیت اور تخلیق سے ہوتا ہے لیکن رضا کا تعلق ایمان اور اعمال صالحہ سے ہے اور ہم کو خیر وشر دونوں راہ بتادیئے گئے ہیں۔ پس جس راہ کو ہم اختیار کریں گے اس کے خواص ولوازم آثار اس پر مرتب ہوں گے(۲)۔

پس جبکہ تکویناً کفر اور کفار کے وجود کی ضرورت ثابت ہوئی(۳) پس اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے فکر فرمادیا گیا اور آپ کے قلب سے ان کی طرف میلان کو کم کردیا گیا ورنہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کشش رہتی تو بعادت غالبہ ضرور ایمان لے آتے۔

کششِ شیخ کا اثر

اس لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر شیخ کشش نہ کرے تو مرید آنہیں سکتا ؎

عشق اول دردل معشوق پیدا میشود تانہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود(۴)

دوسرے بزرگ کا قول ہے ؎

اگر از جانب معشوق نباشد کششے طالب عاشق بیچارہ بجائے نرسد(۵)

پس چونکہ شیوخ اور مربین (۶) کشش کرتے ہیں اس لئے ان کے عتاب میں بھی لطف ہوتا ہے چنانچہ غصہ ہورہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اتنا نہ ہوسکا کہ معذرت ہی کرلو پس ایسے مشائخ کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

---

(۱) اس لئے کہ مشیت وارادہ اور چیز ہے اور کسی بات پر راضی ہونا الگ چیز ہے (۲) کفر کے پیدا کرنے اور کفار کے وجود کی ضرورت ثابت ہوئی کیوں کہ اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں کفر کے وجود سے اسلام کی خوبی ظاہر ہوگی (۳) اس مبحث کے متعلق اگر زیادہ تحقیق کوئی چاہے تو تفسیر بیان القرآن مؤلفہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ میں سورہ بقرہ کے اول رکوع کی تفسیر دیکھ لے (۴) عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے پھر عاشق اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس لئے کہ اگر شمع جلے نہیں تو پروانہ اس کی طرف کیسے متوجہ ہو (۵) اگر معشوق کی طرف سے کشش نہ ہو تو عاشق کبھی معشوق تک نہیں پہنچ سکتا (۶) مشائخ اور ترتیب کرنے والے۔

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دایم ست زانکہ لطف شیخ وزاہدگاہ ہست وگاہ نیست(۱)

پس شیخ کی طرف سے اگر کشش ہوتو مرید خواہ زیادہ مجاہدہ بھی نہ کرے بہت جلد عروج ہوتا ہے اور ترقیات محسوس ہوتی ہیں۔ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں بفضلہٖ تعالیٰ یہ بات ہے کہ مجاہدہ ریاضت زیادہ نہیں کراتے اور نفع اس قدر ہوتا ہے کہ دوسری جگہ برسوں کے مجاہدہ میں نہیں ہوتا خیر یہ سب امور وجدانی ہیں من لم یذق لم یدر (۲) کسی نے خوب کہا ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ما شوے بدانی(۳)

تسلی شیخ کا اثر

مجھے تو اس مقام پر صرف اس قدر بیان کرنا ہے کہ تسلی شیخ کو بڑا دخل ہوتا ہے ترقی باطن میں اور دلجوئی اور تسلی کا سب سے بڑھ کر طریقہ مشورہ ہے چنانچہ کسی شاگرد یا مرید کی اگر دعوت کردو یا کوئی شے دے دو مگر کسی شئے سے وہ اس قدر استدلال عنایت ومہربانی پر نہیں کرسکتا جس قدر کہ اس سے کرسکتا ہے کہ اس کو بلا کر یہ کہدو کہ ہم کو تم سے ایک صلاح (۴) کرنا ہے سنتے ہی اس کا دل ہاتھوں بڑھ جائے گا کہ ہم کو انہوں نے اپنا مخصوص سمجھا ہے اور ہم تو آج سے وزیر بن گئے ہیں۔ میرے نزدیک تو کوئی شے تسلی کے اندر اس قدر دخیل نہیں جس قدر کہ صلاح لینا ہے جس کی دلجوئی کرنا ہو سیدھی بات ہے کہ بلا کر یہ کہدو کہ ہم کو تم سے کچھ صلاح کرنا ہے فوراً اس کو خیال ہوگا یہ ہم سے بہت خوش ہیں ورنہ اگر ناراض ہوتے

(۱) ''میں پیر میخانہ کا غلام ہوں جس کی عنایت پیہم ہوتی ہے نہ کہ شیخ اور زاہد کا غلام جس کی عنایت کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں'' (۲) جس کو ذوق سلیم نہ ہو وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا (۳) ''ایک شخص نے پوچھا کہ عاشقی کیا ہوتی ہے میں نے جواب دیا کہ جب تو ہماری طرح ہوجائے گا تو تجھے پتہ چل جائے گا'' (۴) مشورہ۔

تو مشورہ کیوں لیتے اس لئے ارشاد ہوا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ(۱)۔

قرآن میں تمدن کی تعلیم

لوگ آج کل تمدن کو گاتے پھرتے ہیں، قرآن سے کوئی سیکھ لے کہ تمدن کیا شے ہے اور اس کی تحصیل کا کیا طریقہ ہے لیکن قرآن مجید کا لطف صدرا شمس بازغہ(۲) پڑھنے والے کو نہیں آسکتا۔ قرآن میں لطف اس کو آوے گا جس کی نظر واقعات پر ہو اور اس میں غور کرنے کی عادت ہو اس کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ہم کو معاش و معاد کے وہ طریقے سکھائے ہیں کہ ہماری بہبودی کا انحصار ان ہی طرق میں ہے اور اس سے اگر ذرہ برابر بھی تجاوز ہوگا تو دنیوی اور دینی مصائب کا سامنا ہے واللہ اس کی ہر تعلیم ایسی دل کشی ہے کہ طبع سلیم ہو تو بے اختیار دل کھینچتا ہے ؎

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است(۳)

اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے جیسے بعض محبوبوں میں ایسی دلربائی ہوتی ہے کہ ان کی ہر ادا دلربا ہوتی ہے اور ہر بات ان کی پیاری معلوم ہوتی ہے حتی کہ رونا بھی تو پیارا نظر آتا ہے اسی طرح قرآن و حدیث کی تعلیم ہے چنانچہ اس آیت میں تمدن کی ایسی بے نظیر تعلیم فرمائی گئی ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون اور تمام حکما بھی جمع ہو کر سوچتے تو یہاں تک رسائی نہ ہوتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دانشمندی

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو قرآن و حدیث سے تمدن اور اخلاقی

(۱) ان سے معاملات میں مشورہ کیجئے (۲) دو کتابوں کے نام ہیں (۱) ''پیشانی سے پیر تک جہاں بھی دیکھتا ہوں کرشمہ اور رعنائی دامن کھینچتی ہے کہ سب سے زیادہ پرکشش جگہ یہی ہے''

تعلیم کے استنباط کا بڑا ملکہ تھا۔ ایک روز فرمایا کہ دیکھو حدیث سے ایک قاعدہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے شر سے بھاگے اور یہ چاہے کہ میں ہاتھ نہ آؤں تو بہت دور نہ جاوے نزدیک ہی کہیں جا کر چھپ جاوے اس لئے کہ ڈھونڈھ جب پڑتی ہے تو دور دور تو دیکھنے جاتے ہیں اور پاس کوئی نہیں دیکھتا اور اس قاعدہ کو ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے سمجھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو مکہ معظّمہ سے تشریف لے گئے ہیں تو تین میل پر جا کر غارِ ثور میں چھپے ہیں حالانکہ تمام عالم دشمن اور اونٹنیاں ایسی تیز موجود کہ اگر دھاوا (۱) فرماتے تو کم سے کم مدینہ طیبہ کی آدھی منزل پر تو قیام فرماتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون دانشمند ہوگا آپ تین میل پر جا کر چھپ گئے لوگوں نے دور دور ڈھونڈا اور قریب کسی نے نہ ڈھونڈا جب لاچار ہوگئے تو ایک قائف (۲) کو لائے اس زمانہ میں قیافہ شناس غضب کے تھے اس قائف نے غارِ ثور پر لا کر کھڑا کر دیا کہ اس سے آگے نہیں گئے۔

جہالت کی انتہاء

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جن سے حضرات شیعہ بہت خفا ہیں بلکہ ان میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے کہ جن حضرات کی خاطر سے یہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خفا ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں یہ لوگ ان سے بھی ناراض ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس واسطے کہ انہوں نے اس کا حق کیوں نہ دیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس واسطے کہ انہوں نے اپنا حق کیوں نہ وصول کیا۔ ایک جاہل متعصب شیعی کی حکایت ظرافت آمیز یاد آگئی کہ نماز کے واسطے سنیوں کی مسجد میں گیا وہاں لکھا دیکھا ؎

چراغِ مسجد و محراب و منبر ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ (۳)

دیکھ کر بہت خفا ہوا کہ ہم تو تمہارے واسطے جان کھپاتے پھرتے ہیں اور تم

(۱) اگر تیز رفتار اونٹنی پر جاتے تو مدینہ کے آدھے راستہ تک تو پہنچ سکتے تھے (۲) قیافہ شناس (۳) مسجد کے محراب و منبر کی رونق اصل میں یہ چار حضرات صحابہ ہیں ابوبکرؓ، عمر، عثمان، اور علیؓ۔

کو جب دیکھتے ہیں ان ہی کے ساتھ بیٹھا دیکھتے ہیں اور غصہ میں چھری لے کر چڑھ گیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم مبارک چھری سے چھیل دیا گویا اپنے نزدیک ان کو وہاں سے علیحدہ کر دیا خدا بچاوے جہل سے ایسی محبت سے بھی خدا محفوظ رکھے اور ایسی عداوت سے بھی مامون رکھے غرض ایسے وقت بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا کوئی ان سے پوچھے اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ دشمن تھے تو کیا ایسے وقت دشمن کو ساتھ رکھا کرتے ہیں القصہ جب وہ لوگ غار پر آئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ اپنے قدموں کو دیکھیں تو ہم کو پالیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا)(۱) حضرات شیعہ میں ایک شخص اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ شور وغل مت کرو اول تو حزن کے معنی شور وغل کے نہیں دوسرے آگے اِنَّ اللّٰهَ معنا کے کیا معنی ہوں گے یہ توجیہ تو جب صحیح ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کو بھی (نعوذ باللہ) دشمن قرار دیں اور معنی یہ کہے جاویں کہ شور وغل مت کرو اللہ میاں ہمارے ساتھ ہیں وہ سن لیں گے سبحان اللہ کیا اچھا حق ادا کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن گردانا۔

کفار کی عقل پر پردہ

الحاصل ان لوگوں نے اِدھر اُدھر تلاش کیا اُدھر حق تعالیٰ کی یہ قدرت ظاہر ہوئی کہ اسی وقت غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا اور کبوتر نے انڈے دے دیئے۔ انہوں نے قائف سے کہا کہ احمق ہوا ہے اس غار میں تو کسی طرح جا نہیں سکتے اس لئے کہ اس کے منہ پر مکڑی کا جالا ہے اور کبوتر نے انڈے دے رکھے ہیں۔ کبوتر وحشی جانور ہے یہ انڈے بچے ویرانہ میں دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو مجنون ہے۔ قائف نے کہا کہ کچھ کہو واللہ آگے نہیں بڑھے حق تعالیٰ نے عقول پر ان

(۱) گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

کی ایسا پردہ ڈالدیا کہ قائف سے اتنا سننے کے بعد بھی اتنا نہ ہوا کہ علی سبیل الاحتمال(۱) ہی غار کے اندر دیکھ لیتے اگرچہ احتمال بعید تھا لیکن جو شخص کسی شئے کی تلاش کیا کرتا ہے تو ایسی ایسی جگہ بھی دیکھتا ہے جس میں بالکل احتمال نہ ہو جیسے کسی بنئے کی تھالی کھوگئی تھی تو اس نے سب جگہ دیکھا حتی کہ گھڑے کے اندر بھی کہ شاید اس میں نہ ہو حالانکہ اس میں کسی درجہ میں بھی احتمال نہ تھا تو احتیاطاً غار میں بھی دیکھ لیتے لیکن عقل اور وہم اور خیال سب قوتیں حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جس طرف چاہیں اُن کو پھیر دیں۔ دیکھ بھال کر چلے گئے غرض اس قصہ سے یہ نکلا اگر چھپنا ہو تو قریب جگہ چھپنا چاہیئے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھولے بھالے نہیں ہوتے عقل کامل ان کو عطا ہوتی ہے۔

انبیاء اور مرشدین، کامل العقل ہوتے ہیں

اور بعض بزرگوں کی نسبت جو بھولے ہونے کو صفت کمال شمار کیا جاتا ہے تو یہ صفت ان بزرگوں کی ہے جن کے متعلق ارشاد اور تربیت نہیں ہے(۲) اور جن حضرات کو ارشاد اور تربیت اور ہدایت کا کام سپرد ہوتا ہے وہ بھولے نہیں ہوتے وہ سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کی بھی یہی شان ہوتی تھی کہ بڑے عاقل ہوتے تھے کوئی شخص ان کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

بعض سادہ لوح بزرگوں کی حکایات

اور جو بزرگ یکسو ہیں اور ہدایت ان کے سپرد نہیں وہ البتہ بھولے ہوئے ہیں، چنانچہ ہمارے دوستوں میں ایک شخص تھے بہت بھولے تھے اور فطرۃً ایسے ہی تھے ان سے کسی نے کہہ دیا کہ جب کنکوا اڑاؤ گے(۳) جب نجات ہوگی ورنہ نجات

(۱) احتمال ہی کے درجہ میں (۲) جن کے متعلق دعوت وتبلیغ اور تربیت اخلاق کی خدمت نہیں ہے (۳) گڈی پتنگ وغیرہ اڑاؤ گے تو نجات ہوگی۔

نہ ہوگی بے چارے کنکوا اڑانے کے لئے تیار ہوگئے۔ ایک اور بزرگ تھے ان کو کسی نے کہہ دیا کہ ڈھول گلے میں ڈالکر بجاتے پھرو تو نجات ہوگی چنانچہ مستعد ہوگئے (۱) اور ان کنکوے والے کی ایک اور حکایت ہے کہ ایک عورت جارہی تھی کسی ظریف نے کہا کہ میاں صاحب دیکھتے ہو اس کے سینے پر دوا بھری ہوئی کیا چیزیں ہیں اس کے پھوڑے ہورہے ہیں جب تک تم ہاتھ نہ پھیروگے تو اچھے نہ ہوں گے، بہتر ہے کہ ہاتھ پھیر دو کسی کو تم سے نفع ہو تو کیا حرج ہے ورنہ قیامت میں پکڑ ہوگی کہ ایک شخص تمہارے سبب تندرست ہوجاتا مگر تم نے بخل کیا، بے چارے ہاتھ پھیرنے کو مستعد ہوگئے۔ دوسرے شخص نے اس مشورہ دینے والے کو دھمکایا کہ میاں کیوں ان کو پٹواتے ہو۔ ایک اور حکایت ان کی یاد آئی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ تمہاری بی بی عورت ہے یا مرد کہنے لگے کہ نتھ پہن رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہے۔ آج کل لوگ ایسے لوگوں کو بہت بزرگ جانتے ہیں اور جو عاقل ہیں ان کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ایسے ہی ہیں جیسے ہم ہیں غرض بھولے بھالوں کی بزرگی کا انکار نہیں لیکن یہ حکایتیں ان بزرگوں کی ہیں جن کے متعلق خلق اللہ کی ہدایت نہیں ہے اور جو ورثۃ الانبیاء ہیں وہ کامل العقل اور تام الفہم (۲) ہوتے ہیں کسی کی مجال نہیں کہ ان کو دھوکا دے سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیصر روم کے پاس قاصد بھیجا تھا قیصر نے پوچھا کہ تمہارا خلیفہ کیسا ہے؟ اس قاصد نے کیا جامع اور مختصر جواب دیا ہے یہ کہا کہ ہمارے

(۱) یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوگئے (۲) جو بزرگ انبیاء کے علوم کے وارث ہیں ان کی عقل بھی کامل اور ان کی سمجھ بھی مکمل ہوتی ہے۔

خلیفہ کی شان یہ ہے (لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ) یعنی نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے اور نہ کسی دوسرے کے دھوکے میں آتا ہے۔ ہرقل سنکر متحیر رہ گیا(۱) اور اپنے لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید اس کے ساتھ ہے اس لئے کہ دھوکہ نہ دینے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین اس کا کامل ہے اور دھوکہ نہ کھانا یہ علامت ہے عقل کے کامل ہونے کی پس جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں اس پر ہم غالب نہیں آسکتے اس کا ارادہ ایمان لانے کا تھا لیکن قوم نے مخالفت کی اس لئے رہ گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیدار مغزی

ایک اور قصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ایک مرتبہ اونٹ تقسیم فرمارہے تھے اور دو دو آدمیوں کو ایک ایک اونٹ دے رہے تھے ایک اعرابی آیا اور اس نے عرض کیا یا امیر المومنین احملنی وسحیما علی بعیر واحد یعنی مجھ کو اور سحیم کو ایک اونٹ دیجئے سحیم آدمی کا نام زیادہ ہوتا تھا اور مشک (۲) کو بھی کہتے ہیں مگر اس کے معنی میں مشہور نہیں تو بظاہر وہ دھوکہ سے چاہتا تھا کہ مجھ کو ایک اونٹ سالم مل جاوے اور یہ شخص تھا غریب لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً سمجھ گئے اور فرمایا میں تجھ کو قسم دیتا ہوں سچ بتلاؤ سحیم سے مراد مشک ہے۔ اُس نے عرض کیا یا امیر المؤمنین مشک ہی مراد ہے۔ فرمایا کہ ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہو غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی کسی کے دھوکہ میں نہیں آئے اہل ارشاد کی یہی شان ہوتی ہے۔ پس انبیاءؑ بھولے بھالے نہیں ہوئے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیدار مغزی اور کمال عقل اس قصہ سے سمجھی گئی کہ ایسے تشویش کے وقت اس قدر قریب جاکر چھپے غرض ہم کو حق تعالیٰ نے ایسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائے ہیں کہ اخروی فلاح تو ان کے اتباع میں منحصر ہے ہی دنیوی

(۱) حیران رہ گیا (۲) چمڑے کا ایک برتن جس میں پانی بھرا کرتے تھے۔

کامیابی بھی ان کی اطاعت کے ساتھ وابستہ ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری(۱)

اور دوسرا شعر کہتا ہے ؎

لیس علی اللّٰہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد (۲)

الحاصل قرآن مجید کی تعلیم سے معلوم ہوا کہ مشورہ دلجوئی کا بڑا سبب ہے یہ تمام تر تقریر اس آیت کی شان نزول میں تھی میرا ارادہ اس قدر تطویل کا نہ تھا لیکن اتفاق سے بیان طویل ہوگیا مگر بہت سی کام کی باتیں اس سے معلوم ہوگئیں۔

حقیقت توکّل

باقی مجھ کو اس وقت اصل مقصود آیت ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾(۳) سے ایک کوتاہی اور غلطی کا بیان کرنا ہے اگرچہ وہ کوتاہی کوئی بڑی معصیت نہیں ہے(۴) تاہم غلطی ضرور ہے۔ اور اس میں عوام تو کیا خواص بلکہ اخص الخواص مبتلا ہیں وہ مضمون میرے ذہن میں اولاً آیا اس کے بعد دل چاہا کہ کسی آیت میں بھی یہ مضمون مل جاوے دفعۃً(۵) یہ آیت ذہن میں آئی اس میں جو غور کیا تو وہ مضمون بہت صاف اور واضح نکلا اول وہ غلطی سنئے وہ غلطی ہے توکل کے متعلق شرح اس کی یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں بہت سے متوکل عملاً بھی ہیں (۶) اور یوں علماً اور اعتقاداً تو سب ہی مسلمان متوکل ہیں (۷) یعنی اس بات کا اعتقاد ہر مسلمان کو ہے

(۱) "یوسفؑ کا حسن عیسیٰؑ کی پھونک اور موسیٰؑ کا ید بیضا تیرے پاس ہے جو کچھ معشوق فرداً فرداً رکھتے تھے تو تنہا رکھتا ہے"
(۲) اللہ کو اس بات سے کون منع کرسکتا ہے کہ وہ ایک ہی ذات میں سارے عالم کی خوبیاں جمع فرمادیں
(۳) معاملات میں ان سے مشورہ کرلیا کیجئے (۴) بڑا گناہ (۵) اچانک (۶) عملاً اللہ پر بھروسہ کرنے والے
(۷) علم اور اعتقاد کے درجہ میں تو ہر مسلمان ہی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔

کہ جو کچھ عالم میں ہوتا ہے وہ موثر حقیقی کی (۱) طرف سے ہوتا ہے اور اسباب کا تعلق مسببات سے محض ظاہری تعلق ہے کوئی مسلمان بھی اس اعتقاد سے خالی نہیں ہے اور اگر خالی ہو تو وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔

نام کے مسلمان

چنانچہ افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض نام کے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ اسباب کو مؤثر حقیقی (۲) جانتے ہیں سو یہ لوگ نام کے مسلمان ہیں ایک صاحب تھے جو بڑے معزز مشہور ہیں اور اعلیٰ طبقہ میں انکا شمار ہوتا ہے ان کی نسبت سنا ہے کہ ایک شخص نے ان کے سامنے کسی امر (۳) کے بارہ میں یہ کہا خدا چاہے گا تو اس معاملہ میں کامیابی ہوگی کہنے لگے کہ اس میں خدا کے چاہنے کی کیا بات ہے ہم تدبیر کرتے ہیں تدبیر سے یہ کام ہوجاویگا۔ عقل تو مسخ ہو ہی گئی تھی مگر بات بھی برٹ گئی (۴) باوجود صاحب زبان ہونے کے بات بھی کرتے ہیں تو غلط بولنے والے انگریزوں کی طرح سے (۵) اور خیر بات کا تو کچھ نہیں مگر عقائد کفریہ سے تو بچنا چاہیئے لیکن ان کا اسلام کچھ ایسا مضبوط ہے کہ کفر وشرک کرلو جب بھی نہیں جاتا صاحبو! اسلام تو ایسے ناز اور دماغ کا ہے کہ اس سے ذرا اعراض کرو (۶) تو وہ ناراض ہوجاتا ہے۔

''انشاء اللہ'' کے متعلق ایک حکایت

اس حکایت مذکورہ کے مناسب ایک اور لطیفہ یاد آیا ایک احمق چلا جارہا تھا

(۱) اللہ کی طرف سے ہوتا ہے (۲) بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کسی چیز کے وجود کا سبب پایا جائے تو وہ چیز ضرور موجود ہوجاتی ہے (۳) کسی کام کی بابت (۴) انداز گفتگو بھی بدل گیا (۵) یعنی اردو کو انگریزوں کی اتباع میں بگاڑ کر ایسے غلط بولتے ہیں جیسے وہ بولتے ہیں مثلاً ہم تم سے یہ بات کہنا مانگتا ہے وغیرہ (۶) منہ موڑو۔

کسی نے پوچھا کہاں جارہے ہو کہا بازار جاتا ہوں گدھا خریدوں گا اس نے کہا انشاء اللہ کہہ لو کہنے لگا روپیہ میری جیب میں ہے، گدھا بازار میں پھر انشاء اللہ کہنے کا کیا موقع ہے آگے گیا تو کسی نے جیب کترلی اور روپیہ اڑالیا اپنا سامنہ لے کر واپس آئے پھر وہ شخص ملا پوچھا کہاں سے آرہے ہو کہا میں بازار گیا تھا انشاء اللہ اور میرا روپیہ چوری گیا انشاء اللہ اور گدھا میں نے نہیں خریدا انشاء اللہ اور اب میں مفلس ہوں انشاء اللہ۔ اب اس کو انشاء اللہ کا ایسا سبق یاد ہوا کہ واقع میں جو موقع انشاء اللہ کا نہ تھا اس میں بھی انشاء اللہ داخل کردیا۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہ تو احمقوں اور ملحدوں کی حکایتیں ہیں لیکن مسلمان کوئی ایسا نہیں ہے جو علماً واعتقاداً اس کا قائل نہ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے چاہنے سے ہوتا ہے۔

ترک اسباب کا حکم

مگر گفتگو اس توکل میں نہیں ہے بلکہ گفتگو توکل خاص میں ہے جو بمعنی ترک اسباب ہے (۱) اور ترک اسباب مطلقاً مراد نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ جو اسباب ایسے ہیں کہ عادتاً مسبب اسی پر مرتب ہوتا ہے (۲) ایسے اسباب تو ترک کرنا حرام ہے ہاں اس کی تقلیل کردے (۳) جیسے کھانا پیٹ بھرنے کے لئے پینا سیرابی کے لئے، سونا راحت کے واسطے۔ اگر کسی نے یہ اسباب ترک کردیئے اور مرگیا تو گنہگار ہوگا۔

---

(۱) اسباب کو اختیار نہ کرنا (۲) عادۃ ایسا ہوتا ہے کہ جب سبب پایا جائے تو مسبب بھی پایا جائے یعنی جب آگ پر کوئی چیز رکھو گے وہ اس کو جلائے گی (۳) اس میں کمی کردے۔

ذکر کا فائدہ

ہاں اگر کسی کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ عادت ہوجاوے کہ اس کو بغیر کھائے بھوک نہ لگے اور ضعف نہ ہو(۱) تو مستثنیٰ ہے جیسے بعض بزرگوں نے سال سال بھر نہیں کھایا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متواتر کئی کئی روز بدوں شب (۲) کو افطار کئے ہوئے روزہ رکھتے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی دیکھ کر شروع کئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا (ایکم مثلی انما یطعمنی ربی ویسقینی) یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے مجھ کو تو میرا رب کھلا پلا دیتا ہے ذکر اللہ سے ایسے حضرات کو ایسی سیری حاصل ہوجاتی ہے جیسے غذا سے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

وذکرك للمشتاق خیر شراب وکل شراب دونه کسراب (۳)

عقلی دلیل

اور کثرت ذکر کا یہ تو خاصہ مشترکہ ہے کہ بھوک کم لگتی ہے بیقراری نہیں ہوتی آج کل عقل پرستی کا بہت زور ہے شاید اس پر کوئی سوال کرے کہ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی اس لئے اس کی میں وجہ عقلی بھی بیان کئے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ جب خیال آدمی کا دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے تو بھوک پیاس کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ دیکھ لو جو لوگ کسی کام میں منہمک ہوتے ہیں اور غایت مشغولی ہوتی ہے (۴) تو کھانے کا وقت گزر جاتا ہے یاد بھی نہیں آتا کہ ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ پس جب دنیوی مشاغل میں یہ حالت ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد تو اس سے کہیں بڑھ کر

(۱) کمزوری (۲) بغیر (۳) مشتاقین کے لئے آپ کا ذکر بہترین مشروب ہے اس کے علاوہ باقی مشروبات ان کے لئے مثل سراب کے ہیں (۴) بہت زیادہ مصروف ہوں۔

ہے۔ اس کی محبت کی شراب تو ایسی ہے کہ بھوک پیاس تو علیحدہ آدمی اپنے کو بھول جاتا ہے عوام کے مسلمات سے ہی اس کا پتہ چلتا ہے عورتیں کہا کرتی ہیں کہ ان کو بھوک نہیں لگتی ان کا پیٹ تو اللہ کے نور سے بھرا ہوا ہے تو یہ واقعی بات ہے کہ نورِ ذکر وہ شئے ہے کہ طبیعات اس سے مغلوب ہوجاتی ہے۔ میرے ایک ذاکر دوست کہتے تھے کہ میں نے آزمایا تھا کہ دیکھو کتنے دن نہیں کھاسکتا دس بارہ دن تک متواتر نہیں کھایا تو کچھ زیادہ ضعف محسوس نہیں ہوا پس یہ لوگ تو مستثنیٰ ہیں لیکن جو ایسا نہ ہو اور پھر کھانا پینا ترک کردے اور مرجاوے تو حرام موت مرے گا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ہم پر ہم سے زیادہ رحم ہے کہ اس طور سے اپنے کو ہلاک کردینے کو حرام فرمادیا۔ پس ایسے اسباب کو ترک کردینا جائز نہیں ہاں ایسی تقلیل جو مفضی الی الضعف المفرط نہ ہو جائز ہے(۱)۔

اسباب میں انہماک

اور جس طرح ترک اسباب ناجائز ہے اسی طرح اسباب میں انہماک بھی ناجائز ہے۔ مثلاً کھانے ہی کی صورت میں نہ یہ جائز ہے کہ بالکل ترک کردے اور نہ ایسا انہماک جائز ہے کہ جو ملے کھاجائے، نہ حرام کی تمیز کرے نہ حلال کی ایسے امور میں اسی توسط کا نام توکل ہے ایک قسم اسباب کی یہ ہوئی۔

اسباب کی دوسری قسم

اور بعض اسباب وہ ہیں کہ مسبب ان پر بلا اسباب کے بھی مرتب ہوجاتا ہے جیسے کسب مال کے ذرائع مال کی تحصیل کے لئے کہ مسبب ان ذرائع پر

(۱) اتنی کمی کرنا جو نقصان دہ کمزری تک نہ پہنچائے جائز ہے۔

موقوف نہیں ہے بلا ان اسباب کے بھی بکثرت ترتب ہوجاتا ہے۔(۱) ایسے اسباب میں توکّل یہ ہے کہ اگر اپنے نفس میں قوت پاوے اور پریشانی نہ ہوتو ترک کردینا جائز ہے۔

اسباب کی تیسری قسم

تیسرے اسباب وہمیہ (۲) کہ مسبب کا مرتب ہونا ان پر بہت بعید ہے جیسا دور دراز کا سامان کرنا کہ فلاں جگہ سے روپیہ مل جاوے تو جائداد خریدوں گا۔ اور اس جائداد کی آمدنی سے ایک تجارت کا کارخانہ کھولوں گا اس کے بعد فلاں کام کروں گا یہ سوچ کر اُن اسباب میں ایسا مشغول ومنہمک ہوگیا کہ حلال وحرام کی بھی تمیز نہ رہی ایسے اسباب کا ترک واجب ہے۔ پس اسباب کی کل تین قسمیں ہوئیں اسباب قطعیہ، اسباب ظنیہ، اسباب وہمیہ۔ اسباب قطعیہ کا ترک حرام اور اسباب ظنیہ کا ترک بشرط قوت نفس مندوب (۳) اور اسباب وہمیہ کا ترک واجب۔

توکل کے معنی

صوفیہ کرام توکل سے مراد اسباب ظنیہ کا ترک لیتے ہیں اور قرآن مجید اور احادیث میں جہاں توکل کا امر ہے اس سے کہیں تو تقلیل یا ترک اسباب ظنیہ مراد ہے اور کسی جگہ ترک اسباب وہمیہ مقصود ہے یہ تقریر تو نفس توکل کے متعلق تھی۔

متوکلین کی ایک غلطی

اس کے بعد سنئے کہ توکل کے متعلق بعضے خواص متوکلین ایک غلطی میں مبتلا ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ متوکلین کی حالت باعتبار توکل کے تمام احوال میں یکساں نہیں

(۱) یعنی مال کا حصول ان ذرائع پر موقوف نہیں ہے کبھی ان کے بغیر بھی مال مل جاتا ہے (۲) خیالی اسباب (۳) اگر نفس اس کو برداشت کرسکے تو مستحب ہے۔

دیکھی جاتی حالانکہ توکل کا اقتضاء یہ ہے (۱) کہ تمام احوال میں حق تعالیٰ پر یکساں نظر ہو لیکن ان کے مختلف احوال میں بڑا فرق دیکھا جاتا ہے اور اس فرق کا احساس خود ان کو بھی نہیں ہوتا اور وہ فرق یہ ہے کہ اسباب کے ترک میں جتنی ان کی نظر حق تعالیٰ پر ہے اس قدر نظر اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں نہیں ہوتی حالانکہ دونوں مواقع توکل کے ہیں کہ دونوں میں تفویض الی الحق (۲) یکساں ہونا چاہیئے گو اسباب کے اختیار کرنے کو اصطلاحاً توکل نہیں کہا جاتا لیکن توکل کی حقیقت جو تفویض الی الحق ہے (۳) وہ تو اختیار اسباب اور عدم اختیار اسباب دونوں میں یکساں (۴) ظاہر ہونا چاہیئے اس لئے کہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ (۵) تو توکل کے لوازم بلکہ حقیقت اس کی یہی تفویض الی الحق ہے (۶)۔ کہ ہر موطن (۷) میں اس کا ظہور ہونا ضروری ہے۔ گو اعتقاداً تو یکساں حالت ہے لیکن حالاً یکساں نہیں ہے دیکھ لیجئے اور اپنے وجدان کی طرف رجوع کر لیجئے متوکلین اور غیر متوکلین سب اس بات کا احساس کر سکتے ہیں کہ ترک اسباب میں جو کیفیت قلب کی تفویض کے اعتبار سے ہوتی ہے اس درجہ کی کیفیت اسباب کے اختیار کرنے میں نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص نوکری یا تجارت چھوڑ کر بیٹھ گیا تو جیسی نظر اس صورت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اس مرتبہ کی نظر اس صورت میں نہیں ہے کہ کھانا کھا رہے ہیں اس صورت میں حالاً نظر اس پر ہے کہ کھانا کھانے سے شبع ہوگا (۸) یہ حالت نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اگر چاہیں گے تو شبع اور قوت حاصل ہوگی ورنہ نہیں۔ یا مثلاً مکان بنوا رہے ہیں یہاں اس قسم کی نگاہ حق تعالیٰ پر نہیں بلکہ اسباب پر نظر ہے جتنا روپیہ پاس ہے اس

(۱) تقاضا (۲) اللہ کے سپرد کرنا (۳) اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنا (۴) اسباب اختیار کرنے نہ کرنے میں برابر ہے (۵) جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے (۶) توکل کا لازمہ بلکہ اس کی حقیقت اپنے کو اللہ کے سپرد کرتا ہے (۷) ہر موقع پر اس کا ظاہر ہونا ضروری ہے (۸) پیٹ بھر جائے گا۔

پر نظر ہے اور آئندہ کے لئے فکر ہے کہ کیسے اس کی تکمیل ہوگی پس اس فرق کے کیا معنی؟

یہ ہے وہ غلطی جو اول میرے ذہن میں آئی اس کے بعد تلاش ہوئی کہ کہیں شریعت میں بھی اس کا پتہ ہے یا نہیں چنانچہ بعد تلاش کے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ صریح دلالت اس مضمون پر اس آیت کو ہے۔

اختیار اسباب کے ساتھ توکل

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ یعنی ان سے کام میں مشورہ کیجئے پھر جب آپ عزم کریں گے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اس آیت میں ایک مرتبہ تو ہے مشورہ کا اور دوسرا مرتبہ ہے عزم کا یعنی جب مشورہ میں پختہ ارادہ ایک جانب کا طے ہوجائے اس کے بعد حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے یہ ظاہر بات ہے کہ مشورہ ایک تدبیر ہے پس مشورہ کا محل وہ امر ہوگا جو محل تدبیر ہو(۱) اور اس کا تعلق اسباب اور تدبیر سے ہو غیر اختیاری نہ ہو اور نیز عزم کا حاصل ہے ترجیح احد المقدورین (۲) اس سے بھی واضح ہوجاتا ہے کہ امر اختیاری کے متعلق یہ ارشاد ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ جن امور کا تعلق اسباب سے ہے ان کی نسبت ارشاد ہے کہ ان کے اسباب اور تدابیر میں اول آپ مشورہ فرمائیے اور مشورہ میں جو امر طے ہو یعنی جس سبب کی مباشرت قرار پائے جب آپ اس سبب کا عزم فرماویں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے پس اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ توکل کچھ اسی موقع کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ جس میں اسباب کو ترک کردیا جاوے بلکہ اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں

---

(۱) مشورہ اس کام میں کیا جاتا ہے جہاں تدبیر کارگر ہو (۲) ایسی دو باتیں جن پر آدمی قادر ہو انمیں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دینا عزم کہلاتا ہے۔

بھی توکل مع اپنے آثار ولوازم کے ہونا چاہیئے (۱) اب دیکھ لیجئے کہ اس حالت میں توکل کس کے اندر ہے۔ عوام تو عوام خواص جو تارک اسباب یا مقلل اسباب ہیں (۲) ان میں بھی یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے کہ جیسے ان کی نظر ترک اسباب کی صورت میں اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے اس درجہ کی نظر اسباب کے اختیار کرنے کی حالت میں نہیں ہوتی تو یہ بڑی کوتاہی ہے اور حقیقت میں توکل کی صفت میں کمی ہے اور اپنی اس غلطی پر تنبیہ نہیں ہے۔

سفر میں توکل

مجھ کو خود اس پر تنبہ نہیں تھا سفر میں یہ بات محسوس ہوئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سفر میں تو توکل کی صفت کا ظہور زیادہ ہوتا ہے یعنی جب کہیں سفر ہوتا ہے تو قلب خوف ورجا میں ہوتا ہے (۳) کہ دیکھئے گھر واپسی ہوگی یا نہیں اگر حق تعالیٰ خیر وعافیت رکھیں گے تو ہوجاوے گی ورنہ ممکن نہیں ہے کوئی عارض ایسا پیش آجاوے کہ جو راہ ہی میں ختم ہوجائیں حالانکہ اسباب گھر پہنچنے کے موجود ہیں لیکن ان اسباب پر نظر نہیں ہوتی صرف حق تعالیٰ پر ہوتی ہے پس اس مقام پر تو حالی توکل حق تعالیٰ نے نصیب کردیا اور ممکن ہے کہ یہ امر میرے ضعف قلب سے ہو (۴) اور میں اس کو توکل سمجھتا ہوں بہرحال جو کچھ بھی ہو اس حالت میں نظر حق تعالیٰ پر ہوتی ہے یہ تو سفر کی حالت تھی اور مسجد سے گھر جانے تک یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ قلب کے اندر خوف ورجا کی کیفیت ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو پہنچیں گے ورنہ نہیں۔

---

(۱) اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں بھی توکل اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ہونا چاہیئے (۲) جنہوں نے اسباب ترک کئے یا ان میں کمی کی (۳) دل میں خوف اور امید کی حالت جمع ہوتی ہے (۴) دل کی کمزوری۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا توکل

جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت ہر وقت تھی چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب سے فارغ ہوکر فوراً تیمّم فرمالیتے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی تو موجود ہے آپ فرماتے ہیں کہ شاید پانی تک نہ پہنچ سکوں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہر وقت اور ہر حال میں حق تعالیٰ پر تھی یہ بات ہم لوگوں کو میسر نہیں۔

توکل کا مقتضی

ہماری جو حالت کلکتہ جانے سے ہوتی ہے اسٹیشن پر جانے میں وہ کیفیت نہیں ہے یا مثلاً مکان بنوارہے ہیں جتنا روپیہ پاس ہے اس کا نقشہ تو سامنے ہے اور آگے کا کھٹکا ہے گویا روپیہ کے اختتام کے بعد تو حق تعالیٰ پر نظر ہے اور روپیہ ہونے تک اسباب پر نگاہ ہے، توکل کا مقتضا تو یہ تھا کہ اسباب کے ہوتے ہوئے بھی حق تعالیٰ ہی پر نظر ہوتی ہے کہ اگر وہ چاہیں گے تو مکان بنوادیں گے ورنہ نہیں سو یہ حالت نہیں ہے اور لیجئے جیسے دوا پی کر صحت کی امید میں حق تعالیٰ پر نظر ہوتی ہے ایسی نظر اس وقت تک نہیں ہوتی کہ جوشاندہ پک کر ہمارے پاس آرہا ہے اس وقت یہ احتمال نہیں ہوتا کہ شاید راستہ ہی میں گر جائے اور ہم تک نہ پہنچے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خوف ورجا ہر وقت ہونا چاہیئے اس لئے کہ خوف ورجا توکل کے لوازم سے ہے۔ حالانکہ ہماری یہ حالت نہیں بیشک یہ کمی ہے حال کی اور بڑی بھاری کمی ہے کہ جس کی طرف آج تک التفات بھی نہ ہوا تھا۔

سفر کا فائدہ

اسی ہفتہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر تنبہ ہوا اور سفر کی بدولت یہ بات سمجھ میں آئی۔ میں کہا کرتا تھا کہ سفر عذاب جان ہے مگر اس سفر میں اس علم کے حاصل ہونے سے یہ خیال بدل گیا اور معلوم ہوا کہ سفر بسا اوقات سبب بہت سے فوائد کا ہوتا ہے مگر اس کا احساس چھوٹے سفر میں نہیں ہوا بڑے سفر میں ہوا یہ ریل کی برکت ہے کہ اس کے سبب توجہ الی اللہ ہوئی اسی طرح ریلوں کے قصے جو سنے گئے کہ لڑ جاتی ہیں(۱)۔ اس روز سے جب ریل میں سوار ہونے کا اتفاق ہوتا ہے تو خوف معلوم ہوتا ہے کہ دیکھئے صحیح سلامت گھر پہنچتے ہیں یا نہیں۔ اور حق تعالیٰ پر نظر ہوتی ہے کہ وہی چاہیں گے تو پہنچائیں گے اس اعتبار سے ان ریلوں کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہو گیا اس لئے کہ جو شئے توجہ الی اللہ کا سبب ہو جاوے اس کی رحمت ہونے میں کیا شک ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کی حالت خوف

عمر بن عبدالعزیز کی حکایت یاد آ گئی کہ ان کے مکان میں ایک زینہ تھا جب وہ اس پر چڑھتے تھے اس کی ایک اینٹ ہلا کرتی تھی ایک لونڈی نے اس کو گارا لگا کر مضبوط و درست کر دیا ایک بار جو وہ چڑھے تو وہ ہلی نہیں پوچھا کہ اینٹ کیوں نہیں ہلی عرض کر دیا گیا کہ اس کو درست کر دیا گیا ہے فرمایا کہ اس کا ہلنا ہمارے لئے رحمت تھا کہ ہم جب اس پر قدم رکھتے تے تو ہم کو پلصراط یاد آتا تھا کہ اے اللہ اس اینٹ سے جب ہم کو اندیشہ ہوتا ہے تو پلصراط پر کیا حال ہوگا۔ پس منشا میرے اس اندیشہ و خوف کا جو کہ ریل میں ہوتا ہے اگر ضعف قلب و وہم

(۱) آپس میں ریلیں ٹکرا جاتی ہیں اور ایکسڈنٹ ہو جاتا ہے۔

بھی ہو تو جو ضعف سبب ہو جائے استحضار کا تو وہ مبارک ہے اور بہتر ہے اس قوت سے جو کہ غفلت کا باعث ہو ایسی قوت کس کام کی ہے۔ ایک مختصر سی بات تھی جس کو میں مختصر ہی بیان کرنا چاہتا تھا لیکن مضمون طویل ہو گیا یہاں سے بھی یہ مسئلہ جس کا ذکر کر رہا ہوں ثابت ہو گیا اور اپنی بصیرت کی کمی بھی معلوم ہو گئی کہ اختصار کے قصد کے وقت نظر ہونی چاہیئے تھی حق تعالیٰ پر کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو گی تو اختصار ہو گا ورنہ نہیں مگر اس سے غفلت ہوئی۔

مقصود وعظ

اور میرا مقصود اس مضمون کے اظہار سے یہ نہیں کہ اسباب کو ترک کر دیا جاوے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جیسے ترک اسباب میں خدا تعالیٰ پر نظر ہے اسی طرح اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں بھی ہونا چاہیئے غرض کسی وقت مسبب سے غفلت نہ ہو، ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

عقل در اسباب می دارد نظر عشق می گوید مسبب رانگر(۱)

یعنی اسباب سے نظر متجاوز کر کے خالق الاسباب کو دیکھو اسباب پر جس طرح اعتقاداً نظر نہیں ہے حالاً بھی نظر نہ ہو مثلاً ایک شخص لکڑی سے کسی کو مار رہا ہے تو جو کوتاہ بین ہے وہ تو کہے گا لکڑی مار رہی ہے اور جس کی نظر اس سے آگے ہے وہ کہتا ہے کہ بے وقوف لکڑی کیا مارتی ہاتھ مارتا ہے اور حقیقت بین ضارب کی طرف نسبت کرے گا۔ پس اسباب کو ایسی حیثیت سے مت دیکھو جس حیثیت سے اس ظاہر بین شخص نے لکڑی کو دیکھا۔

---

(۱) ''عقل اسباب پر نظر رکھتی ہے اور عشق مسبب پر نظر رکھتا ہے''۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچونے یک دہاں پنہاست در بسہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے وہوے درفگندہ در شما(۱)

قال الجد ارللوتد، لم تشقنی، قال الوتد: انظر الی من یدقنی یعنی دیوار نے میخ (۲) کو کہا کہ تو مجھ کو کیوں چیرتی ہے میخ نے کہا کہ اس شخص کو دیکھ جو مجھ کو ٹھونکتا ہے۔ا

مولانا فرماتے ہیں ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین نیستم در صف طاعت بین بیں
بنگر اے دل گر تو اجلالیتی درمیان اصبعین کیستی
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ است(۳)

حقیقت میں اگر غور کیا جاوے تو کوئی شے بھی اپنے قبضے میں نہیں ہے اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی ذات پر تو قبضہ ہے ہی نہیں دوسری شے تو علیحدہ۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ حالت کس طرح میسر ہوسکتی ہے تو اسکا طریقہ کثرت مراقبات و مجاہدات اور شیخ کامل کی صحبت ہے۔

شبہ کا جواب

اب یہاں ایک شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ تمہاری تقریر کا حاصل تو یہ ہوا

---

(۱) ''بانسری کی طرح ہم دو منھ رکھتے ہیں ایک منہ اس کے لبوں میں چھپا ہوا ہے اور دوسرے منہ کا رخ تمہاری طرف ہے اور اس سے ہائے ہو کا شور برپا ہو رہا ہے'' (۲) کیل سے کہا (۳) ''میں طاعت کی صف میں جو بیچ میں ہوں وہ طاعت کی وجہ سے نہیں ہوں بلکہ قلم کی طرح دو انگلیوں کی درمیان پھنسا ہوا ہوں۔'' اے دل اگر تو بزرگی چاہتا ہے تو تو بھی غور کر کہ تو کن دو انگلیوں کے درمیان پھنستا ہے۔ میری گردن میں دوست نے رسی باندھ رکھی ہے اور جدھر کو اس کی طبیعت چاہتی ہے مجھے کھینچ کر لے جاتا''۔

کہ توکل کی شان یہ ہے کہ آدمی ہروقت ایسے ہی خوف ورجا کے اندر رہے جیسے ترک اسباب کی صورت میں رہتا ہے۔ پس تم تو تردد اور تذبذب اور پریشانی اور بے اطمینانی کی تعلیم کرتے ہو حالانکہ بزرگوں کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خلجان(۱) بالکل نہ ہو قلب مطمئن ہو اور بعض آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ لا كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾(۲) غرض قرآن و حدیث اور بزرگوں کے اقوال سے تو قرار کی تعلیم ہوتی ہے اور تم بیقراری سکھلاتے ہو دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ یعنی جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کو کافی ہے یہ آیت بھی سکون کی تعلیم کرتی ہے اور تمہاری تقریر سے حرکت اور اضطراب کی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔

بات یہ ہے (حفظت شیا وغابت عنك اشیاء)(۳) حق تعالیٰ کے ارشاد سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب کو قرار دے لو یہ کہیں وعدہ نہیں ہے کہ جو جانب تمہاری مرضی کے موافق ہے اس کا ہی وقوع ہوگا(۴) کم من فئۃٍ میں خود اس کی طرف اشارہ ہے کہ بعض جماعتیں مغلوب بھی ہوتی ہے اسی طرح ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ میں کفایت کا مطلب یہ نہیں کہ حسب مرضی سب کام ہوا کریں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو مناسب ہوگا اس کا

(۱) پریشانی (۲) سورۂ بقرہ:۲۴۹ (۳) ایک چیز تمہاری نظروں میں ہے اور باقی باتیں نظروں سے اوجھل ہیں (۴) اور اگر یہ شبہ ہو کہ بعض متوکلین نے کسی ایک ہی جانب کا یقین کرلیا ہے اور حدیث لو اقسم علی اللہ لابرہ سے اس کی محمودیت بھی معلوم ہوتی ہے پھر شبہ عود کر آیا جواب یہ ہے کہ یقین اسباب پر نظر کر کے نہیں ہوا اس مرتبہ میں خوف ورجا یعنی احتمال کا استحضار ضروری ہے اور اگر غلبہ حال میں حق تعالیٰ پر نظر کر کے ایک جانب کا جزم ہو جاوے اس کی نفی مقصود نہیں ۱۲ منہ۔

ظہور ہوگا اور جو کچھ واقع ہوگا وہی مصلحت ہوگا کارسازی ان کی شان ہے کہ خواجہ خودروش بندہ پروری داند(۱) جیسے بچہ کو طبیب کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس پر کفایت ہوجاتی ہے اور تردد نہیں رہتا اس لئے کہ جانتے ہیں کہ جو اس کے لئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریگا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو بچہ چاہے وہ ملے گا، حلوا مانگے گا تو حلوا ملے گا اور مٹھائی چاہے گا تو مٹھائی ملے گی بلکہ جو شے (۲) اس کے لئے مفید اور نافع ہوگی خواہ اُس کو گوارا ہو یا ناگوار وہ ملے گی۔ پس تردد تو تصور کے درجہ میں ہے اور سکون ہے حال کے مرتبہ میں یعنی تردد تو اس معنی کر ہے کہ دیکھئے قضا وقدر سے کیا واقع ہوتا ہے اور سکون اس پر ہے کہ جو کچھ واقع ہوگا بہتر اور مناسب ہوگا۔

اولیاء اللہ کے اطمینان کی وجہ

چنانچہ جو شق بھی ظاہر ہوتی ہے اس پر یہ حضرات اسی طرح مطمئن ہوتے ہیں جس طرح دوسری شق کے وقوع پر (۳) دونوں حالتوں میں سکون کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا ہاں طبعی رنج اور غم امر آخر ہے (۴) پس سکون اور حرکت دونوں اس طرح جمع ہوگئے حاصل یہ ہوا کہ توکل یہ ہے کہ خواہ اسباب کو ترک کرے یا اختیار کرے ہر وقت اس پر نظر ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ چاہیں گے تو یہ کام ہوگا ورنہ نہ ہوگا اور سکون یہ ہے اگر کام نہ بھی ہو تو اس پر قلب کو راضی ہونا چاہیئے کہ یہی بہتر تھا لیکن باوجود اس حالت کے اسباب کو پھر بھی نہ چھوڑے اور انہیں میں دُعا بھی داخل ہے۔

جس پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب یہ امر متعین ہے کہ جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا پھر ایک جانب کی درخواست اور دعا کرنے کے کیا معنی بات یہ ہے کہ اس

(۱) اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ بندہ کی پرورش کیسے کرنی ہے (۲) چیز (۳) دوسری جانب کے واقع ہونے پر (۴) طبعی رنج ہونا دوسری بات ہے۔

میں اظہار ہے افتقار کا (۱) اور اسی لئے دعا کرتے وقت تردد نہ کرو بلکہ جس جانب کو تم خیر سمجھتے ہو اور تمہارے علم میں وہ مصلحت ہے اس کو بالتعین (۲) خدا تعالیٰ سے مانگو ہاں جس کے خیر ہونے میں شبہ ہو وہاں قید لگادی جاوے اور تنگ چشموں (۳) کے نزدیک اس میں بھی بظاہر سخت تعارض معلوم ہوتا ہے کہ مانگی ہوئی چیز بھی خیر ہو اور جب اس کے خلاف واقع ہو تو اس مانگی ہوئی چیز کے مقابل خیر ہو مگر فی الواقع (۴) تعارض کچھ نہیں اس لئے کہ جس جانب کو تم مانگ رہے ہو خیر وہ تمہارے علم کے اعتبار سے خیر ہے اور جو واقع ہوگا وہ نفس الامر کے لحاظ سے خیر ہے۔

بندہ کو علم غیب نہ ہونے کا فائدہ

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو غیب کا علم جو عطا نہیں کیا گیا اس میں بڑی مصلحت ہے اور حکمت ہے ورنہ جس چیز کا نہ ہونا معلوم ہوجاتا اس کو یہ کیونکر مانگ سکتا اور اس صورت میں کہ دعا کا جو مقصود ہے عبدیت اور تذلل اور افتقار (۵) اس سے یہ محروم رہتا پس رضا بالقضا اور دعا اور حرکت اور سکون سب جمع ہوگئے اور کوئی اشکال نہ رہا جیسے گھڑی کے کل پرزے جب علیحدہ علیحدہ کردیئے جاویں تو ناواقف اگر انکو بے ٹھکانے جوڑ دے (۶) تو گھڑی نہ چلے گی اور واقف ہر پرزے کو اس کے ٹھکانے پر رکھدے گا (۷) تو گھڑی چل جاویگی۔

شیخ کامل کی ضرورت

شیخ کامل کا یہی کام ہے کہ وہ ایسے شبہات اور تعارض کو دفع کرتا ہے اور

(۱) اس میں اپنی کمزوری کا اظہار ہے (۲) متعین کرکے اللہ سے مانگو (۳) تنگ نظروں (۴) حقیقت میں (۵) دعاء کا مقصد اپنے بندہ ہونے مجبور ہونے اور حاجت مند ہونے کا اظہار کرنا ہے (۶) غلط جوڑ دے (۷) صحیح جوڑ دے۔

یہی ہے وہ بات جو کتابوں کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہوتی اب اس کے بعد جو اشکالات اور شبہات کئے جاویں یا تو منشاء (۱) ان کا اعتراض اور عناد ہے یا غلبہ حال ہے جیسے کسی کا شعر ہے ؎

درمیاں قعر دریا تختہ بندم کردۂ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش (۲)

اگر یہ شاعر حیرت اور غلبۂ حال میں ہے تو معذور ہے مگر جاہل۔ اور اگر معترضانہ کہتا ہے تو ایمان دے بیٹھا۔ لوگ ایسے ہی اقوال سے ابطال شریعت پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حقیقت اور شریعت کو کیسے جمع کریں مولانا ایسے ہی بے باکوں کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند از سخنہا عالمے را سوختند (۳)

اور ایسے اقوال اکثر یا سڑی اور دیوانوں کے ہوتے ہیں اور یا ملحدوں کے عمر خیام کی رباعیاں بہت مشہور ہیں ان میں بہت رباعیاں ایسی ہی ہیں آج کل جاہل لوگ ایسے اشعار بڑے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ یاد رکھو ادب بڑی چیز ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب بے ادب محروم گشت از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد (۴)

اور ایسی گستاخی و بے ادبی جہل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی واسطے

(۱) وجہ (۲) ''دریا کی گہرائی میں تختہ میں باندھ کر مجھے ڈال دیا ہے اور اس کے بعد پھر یہ کہتا ہے کہ ہوشیار رہنا دامن بھیگنے نہ پائے'' (۳) ''ظالم وہ ہیں جنہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور تمام دنیا کو اپنی باتوں سے جلاتے رہے'' (۴) ''ہم خدا سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں کیونکہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہوجاتا ہے۔ بے ادب خود ہی برا نہیں رہتا بلکہ تمام دنیا میں بے ادبی کی آگ لگا دیتا ہے''۔

بڑی ضرورت شیخ کامل کی ہے جو جہل کو دور کرے ایسے جاہل صوفیوں سے تو وہ لوگ بہت اچھے ہیں جو سیدھا سادا نماز روزہ کر لیتے ہیں اور اپنی عمر ختم کر دیتے ہیں۔

حاصل وعظ

الحاصل یہ مسئلہ توکل اچھی طرح محقق ہو گیا اور سب شبہات دفع ہو گئے اور مجھ کو جو کچھ مقصود تھا اس کا بیان شافی کافی ہو گیا اب جس طرح مقصود سے پہلے ایک تمہید تھی اسی طرح مقصود کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند فوائد اس آیت کے بطور لواحق کے بیان کر دیئے جاویں گو مقصود میں ان کا دخل زیادہ نہ ہو سو منجملہ ان فوائد کے ایک امر اس آیت سے یہ مستنبط ہوا کہ تقدیر و تدبیر میں منافات نہیں ہے(۱) چنانچہ مفصل اس کا بیان گزر چکا۔

مشورے کے فوائد

اور ایک فائدہ یہ معلوم ہوا کہ مشورہ دلجوئی کا بہت بڑا آلہ ہے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ مشورہ فی نفسہ مطلوب ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے: (وَاَمْرُ هُمْ شُوْرٰى) یہاں مشورہ اور امر(۲) کو متحد قرار دینے سے یہ بتلا دیا کہ کوئی امر بغیر مشورہ نہ ہونا چاہیئے اس لئے بغیر مشورہ جو کام ہوتا ہے اس کا انجام اگر اچھا ہو گیا تو خیر ورنہ ملامت ہوتی ہے اور اگر چار آدمیوں کے مشورہ سے ہو تو ندامت اور ملامت نہیں ہوتی گو انجام بخیر نہ ہو۔

---

(۱) اس آیت سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ تقدیر اور تدبیر میں کوئی تعارض نہیں (۲) مشورہ اور کام کو ایک جگہ بیان کرنے سے معلوم ہوا۔

فضول مباحث

ایک فائدہ یہ ہے کہ آجکل جن لوگوں کو لیڈر کہا جاتا ہے وہ ایک خاص مسئلہ کے اندر اکثر کلام کیا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ سلطنت جمہوری بہتر ہے یا شخصی ان لوگوں کی وہی مثل ہے ''رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا'' اپنی حد پر نہیں رہتے مولانا فرماتے ہیں ؎

آرزوے خواہ و لیک اندازہ خواہ برنتابدکوہ را یک برگ کاہ(۱)

اے صاحبو! اپنی بساط سے زیادہ مت کُودو۔ حد سے زیاہ مت اچھلو تم سلطنت جمہوری و شخصی کا کیا فیصلہ کروگے تم اپنا ہی فیصلہ کرلو۔ تمہارے اندر رات دن ایک معرکہ رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

موسیٰ وفرعون درہستی تُست (۲)

ایک مصرعہ یاد نہیں رہا۔ اور خاص کر یہ زمانہ تو بہت زیادہ سکوت کا ہے۔ (ھذا وقت السکوت وملازمت البیوت)(۳) جو بالکل ساکت رہتے ہیں اگر ان کو سلطنت نہیں ملتی تو یہ لوگ جو رات دن بیٹھکوں میں بیٹھ کر سلطنتوں کے فیصلے کیا کرتے ہیں ان کو بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بلکہ ایسے لوگوں کی ان خرافات سے قوم کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ان پر وہی مثل صادق ہے۔ گھر کا نہ گھاٹ کا(۴) ادب مانع ہے ورنہ پہلا فقرہ بھی اس مثل کا میں کہہ دیتا۔ خیر یہ مسئلہ ان لوگوں کے زیرِ بحث ہے اور لوگوں کے یہاں فتویٰ اس پر دیا گیا ہے کہ جمہوری سلطنت

(۱) ''آرزو کرلیکن اعتدال کے ساتھ کیونکہ گھاس کا ایک تنکا پہاڑ کو موڑ نہیں سکتا'' (۲) ''حضرت موسیٰ اور فرعون دونوں ہی اللہ کے وجود کا پتہ دیتے ہیں (۳) یہ وقتِ خاموشی ہے اور گھروں میں رہنے کا وقت (۴) مثل یہ ہے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

اچھی ہے اور اصل وجہ تو اس کی صرف یہ ہے کہ یہ لوگ ہر بات میں یورپ پر ایمان لائے ہوئے ہیں یورپ ہی ان کا قبلہ ہے گوٹیڑھا قبلہ ہے۔غرض دلیل کا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ اہلِ یورپ سلطنت جمہوری کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ملایا کہ یورپ جو کہتا ہے وہ حق ہے اس لئے کہ وہ معصوم ہے بس نتیجہ نکال لیا کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو تو نہ شخصی ملتی ہے نہ جمہوری تم کو اس فیصلہ سے کیا ملا ہاں جمہوری سلطنت البتہ مل جاوے گی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے ؎

گربہ میروسگ وزیروموش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند(۱)

آج لوگوں کو حکومت کا بڑا شوق ہے کوئی انجمن بناویں گے اس میں عہدہ دار ہوں گے اور عشق تقلید یورپ میں عہدوں کا نام بھی انگریزی ہی رکھیں گے مثلاً ایک سیکریٹری ہوگا کوئی گورنر بنے گا۔ میں کہتا ہوں بجائے سیکریٹری کے اگر آپ ناظم یا مہتمم یا خادم لقب رکھتے تو کیا حرج تھا اور سیکریٹری ہی پر بس نہیں بلکہ اس کو انگریزوں کی طرح سیکریٹری کہتے ہیں تشبہ نے ناس کردیا ہے ہر شے میں یورپ کے ساتھ تشبہ کا شوق ہے۔

ایک جنٹل مین کی اصلاح

میرے پاس ایک شخص کا خط آیا اپنے نام کے ساتھ اس نے لکھا تھا گورنر یتیم خانہ میں حیران ہوا کہ میرے پاس گورنر کا خط کیوں آیا جب آگے یتیم خانہ کا لفظ دیکھا اس وقت معلوم ہوا کہ یتیم خانہ کے آپ منتظم ہیں گورنر صاحب نے اُس میں

(۱) ''اگر بلی میر بنی ہوئی اور کتا وزیر اور چوہا منشی تو اس قسم کے ارکان حکومت ملک کو ویران کردیتے ہیں''۔

ایک مسئلہ پوچھا تھا۔ لیکن گورنری کے گھمنڈ میں آکر خط میں ٹکٹ بھی نہیں رکھا۔ ہم تھے اپنی مولویت کے عُزّہ میں ہم نے بیرنگ جواب بھیجد یا۔ گورنر صاحب نے واپس کردیا۔ ایک آنہ دینا پڑا۔ جس شہر کا وہ خط تھا اتفاق سے وہاں میرا جانا ہوا تو میں نے اپنے ایک عزیز سے جس کے پاس میں ٹھیرا تھا پوچھا کہ وہ کون گورنر صاحب ہیں میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اور اپنا ایک آنہ وصول کروں گا اور میں نے تمام قصہ ان کی اس حرکت کا ذکر کیا اتفاق سے اُسی وقت اُن گورنر صاحب کے ایک بیٹے بھی بیٹھے تھے جو ولایت سے ڈاکٹری پاس کرکے آئے تھے جب وہ چلے گئے تو بھائی نے کہا کہ یہ ان ہی گورنر صاحب کے بیٹے ہیں ایک گلی میں ایک جھونپڑا ہے(۱) اس میں رہتے ہیں۔ رہتے تو میں جھونپڑے میں اور دماغ ایسا عالی مجھ کو صرف ان کی حماقت ظاہر کرنا تھی۔ ایک آنہ تو اُن سے کیا وصول ہوتا غالب تو ہے کہ ان کے بیٹے نے سارا قصہ نقل کردیا ہوگا۔ یہ حالت ہے گورنری کے مدعی کی۔ کوئی اپنے کو پلیڈر لکھتا ہے۔ مقصود صرف ہیبت اور عظمت بٹھلانا ہے۔

اپنی وضع کا اہتمام

صاحبو! تم لوگ مسلمان ہو تم نے اپنی قومی شعار کو کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھو انگریزوں کو اتنا زمانہ ہندوستان میں ہوگیا۔ مگر انہوں نے اپنا لباس اپنی وضع نہیں بدلی اگر ان کی ہی اقتداء کا تم کو شوق ہے تو ان کی اقتداء تو یہ ہے کہ تم بھی اپنی وضع کو نہ بدلو اپنے عربی کے پاکیزہ الفاظ چھوڑ کر دوسری زبان بلاضرورت کیوں اختیار کرتے ہو اور عربی سے کیوں اس قدر توحش کرتے ہو۔ ہر عاقل کے فعل کی کوئی نہ کوئی غایت ہوتی ہے(۲) آخر اس انگریزی الفاظ کے اختیار کرنے کی بھی کوئی

(۱) چھوٹا سا گھر (۲) غرض۔

غایت ہے بس اس کی غایت غایط بالطا(۱) معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ اس سے شہرت ہوتی ہے اور شہرت سے روپیہ آتا ہے اور روپیہ کا کھانا پکتا ہے اور کھانے کی غایت ظاہر ہے کہ غائط (پائخانہ) ہے یہ سب لغو اور فضول باتیں ہیں۔ چھوڑو ان قصوں کو اور اپنی قدیمی وضع اختیار کرو۔

جمہوریت کے حق میں آیت قرآنی سے غلط استدلال اور اس کا جواب

بہرحال ان حضرات نے یہ فتوے دے دیا اور فیصلہ کر دیا کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے خیر اسی پر رہتے تو کچھ نہ تھا غضب یہ ہے کہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے اور دلیل میں ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ کو پیش کرتے ہیں اس استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا﴾(۲) سے یہ فتویٰ لکھا تھا اور وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا تھا کہ جمع ہو کر کھانا واجب ہے۔ اگر سلطنت جمہوری کی حقیقت صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ جس میں صرف مشورہ ہو تو بیشک یہ استنباط صحیح تھا سلطنت جمہوری میں تو یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی رائے دو رائے کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اس آیت سے اس کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ کے بعد ارشاد ہے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ﴾ صیغہ مفرد مخاطب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشورہ تو کیجئے لیکن مشورہ کے بعد عمل اس پر کیجئے جس کا آپ عزم کر لیں اور اس میں کوئی قید ہے نہیں تو اس میں سب مختلف صورتیں آ گئیں ان صورتوں میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ کہ سب کی رائے ایک جانب ہو اور حضور ﷺ کی رائے ایک طرف تو

(۱) پائخانہ (۲) سورۃ النور: ۶۱۔

اس صورت میں بھی آپ ہی کے عزم اور ترجیح پر مدار رہا پس اس سے تو سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا۔ بلکہ سلطنت جمہوری کی بناء (۱) ہی اس سے منہدم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایسا نہیں ہوتا۔ غرض اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا بلکہ سلطان مشورہ کے بعد مستقل و مستعد ہے کہ اپنی بصیرت خداداد (۲) سے جس صورت کو چاہے اختیار کرلے اور مشورہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کرنے والے کی نظر سے کوئی پہلو اس امر کا مخفی نہ رہے گا ورنہ بسا اوقات ایک شخص کی نظر تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہوتی ہے۔

حکومت شخصی کا اثبات

اور ایک دوسری آیت سے بھی سلطنت جمہوری کا ابطال اور سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے (۳)۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ﴾ (۴) اسی اخیر جملہ سے سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے اس لئے کہ فرض کرو کہ مجلس میں دس آدمی ہیں اور وہ دس اعلیٰ طبقہ کے ہیں اور سردار قوم ہیں ان سب آدمیوں نے اجازت چاہی تو سلطنت جمہوری کا مقتضا تو یہ ہے کہ چونکہ سب اہلِ مجلس ایک طرف ہوگئے تو بادشاہ کو اجازت دینا واجب ہوگا حالانکہ اس صورت میں بھی ارشاد ہے: ﴿فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ﴾ کہ جس کو آپ چاہیں اجازت دیں یہ صاف دلیل ہے کہ حضور ﷺ مستقل بادشاہ ہیں اگر

(۱) بنیاد ہی منہدم ہوجاتی ہے (۲) بادشاہ کو مکمل اختیار ہے کہ وہ بعد مشورہ اپنی رائے سے مستقل طور پر فیصلہ کرے (۳) جمہوری سلطنت کا باطل ہونا اور شخصی حکومت کا صحیح ہونا ثابت ہوا (۴) سورۂ النور: ۶۲۔

قرآن حدیث میں اور زیادہ غور کیا جاوے تو بہت دلائل نکلیں گے ایک فائدہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ آیت میں مشورہ کا بھی ذکر ہے اور عزم کا بھی جو کہ منجملہ تدابیر کے ہیں لیکن آیت کو ختم فرمایا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ﴾ پر جس سے مفہوم ہوا کہ تدبیر تو کرے لیکن اصل مقصود تدبیر کے وقت بھی توکل اور خدا پر نظر رکھنا ہے۔

توکل کی حقیقت

تدبیر کی مشروعیت کی علّت تو محض ہمارا ضعف ہے اور اظہار ہے غایت افتقار(۱) کا کہ اے اللہ ہم ایسے مضبوط نہیں ہیں کہ آپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے محتاج نہ ہوں اور یہاں سے راز معلوم ہوگیا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا کہ کھانا تناول فرما کر آپ دعا فرماتے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا غَیْرَ مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا﴾ یعنی اے اللہ اس روٹی کے ہم محتاج ہیں ہم اس سے مستغنی نہیں ہیں۔ غرض حق تعالیٰ کے سامنے اسباب کی احتیاج کا اظہار اس نظر سے کہ اپنا افتقار الی اللہ ظاہر ہو توکل کے منافی نہیں ہے(۲) ہاں اگر خود ان اسباب ہی کو مطلوب بنالیوے تو یہ البتہ منافی توکل ہے(۳)۔ غرض اسباب اور تدابیر کی مشروعیت ہمارے ضعف اور افتقار(۴) کے اظہار کے لئے ہے نہ کہ ان کو مقصود بالذات بنانے کے واسطے۔

تدابیر کی مشروعیت کی حکمت

اور بعض اہل اللہ نے تدابیر کی مشروعیت کی عجیب حکمت لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ تدبیر کرنا اس لئے جائز کیا گیا ہے کہ ہم تدبیر کریں اور وہ اس کو توڑتے رہیں

(۱) انتہائی محتاج ہونے کا اظہار ہے (۲) اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے فقر کا اظہار توکل کے خلاف نہیں (۳) یہ البتہ توکل کے خلاف ہے (۴) ہماری کمزوری اور فقر کو ظاہر کرنے کے لئے تدبیر کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

تا کہ ہم کو یہ معلوم ہوجاوے کہ ہمارے اسباب اور تدابیر کوئی چیز نہیں۔ موثر حقیقی حقیقت میں ذاتِ واحد ہے چنانچہ بعض اہل حال کے ساتھ عجیب معاملہ ہوتا ہے کہنے کی بات تو نہ تھی لیکن زبان پر آئی ہوئی بات کہدی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنی تدابیر میں کامیابی حاصل ہوتی جاتی ہے اور شاذونادر تدبیر خطا بھی ہوجاتی ہے (۱) اور اہلِ حال وخواص عباد (۲) کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ جو تدبیر وہ کرتے ہیں اکثر توڑ دی جاتی ہے۔ وہ عزم کرتے ہیں کہ فلاں کام نہ کریں گے وہی ان سے صادر ہوتا ہے (۳) آخر رفتہ رفتہ ان کو واضح ہوجاتا ہے کہ ہماری حول اور قوت اور ارادہ لاشئے محض ہے (۴) اور اس کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں اور تفویض محض ان کی شان ہوجاتی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی تہجد کی نماز قضا ہوگئی بہت افسوس ہوا بہت روئے دوسرے روز بڑا اہتمام آنکھ کھلنے کا کیا کھانا کم کھایا پانی کم پیا اور سویرے سے سوئے اس روز صبح کی نماز بھی اڑگئی وہ فرماتے ہیں (ففوضت واسترحت) (۵) کہ اس کے بعد میں نے اپنے کو تفویض کردیا اور راحت سے ہوگیا۔ پس وہ کہتے ہیں کہ تدابیر اسی واسطے ہیں کہ ہم کریں اور وہ توڑیں بہرحال تدبیر کی بھی یہ ایک حکمت ہے مگر یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہی ہے جو حکمت میں نے بیان کی ہے وہ بھی ہے اس میں کوئی تنافی نہیں (۶) ایک شے میں حکمتیں متعدد بھی ہوا کرتی ہیں یہ وہ فوائد ہیں جو ملحقات کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں۔

---

(۱) کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ تدبیر کامیاب نہیں ہوتی (۲) جن پر حال غالب ہوتا ہے اور جو اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں (۳) وہی کام سرزد ہوتا ہے (۴) ہمارے ارادے اور قوت وطاقت کی کوئی حیثیت نہیں (۵) میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردیا اور آرام سے ہوگیا (۶) تعارض نہیں۔

کام کی بات

باقی مقصود بالذات وہ نئی بات تھی جو اور بیان ہوچکی ہے بڑے کام کی اور یادرکھنے کی بات ہے اور عملی مضمون ہے یہ نہیں کہ صرف مزہ لینے ہی کے واسطے ہو بلکہ اس کو اپنا دستورالعمل بنالو کہ جو کام کرو کم ازکم ایک ہی مرتبہ یہ ضرور سوچ لیا کرو کہ اے اللہ یہ کام آپ کے اختیار میں ہے اگر آپ چاہیں گے تو ہوگا ورنہ نہیں ہوگا یہ ایسی سہل اور آسان بات ہے کہ کچھ اس میں مشقت نہیں اور نفع اس میں کثیر ہے (۱) چندروز کرکے تو دیکھو کیا رنگ لاتی ہے۔

اب میں ختم کرچکا ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عمل کی عطا فرماویں۔ آمین یارب العالمین

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین

---

(۱) کچھ مشکل نہیں اور فائدہ اس میں بہت ہے۔

خلیل احمد تھانوی

۱۵/ اکتوبر ۲۰۱۱ء